قاضی کی کوٹھڑی اور کنواری بیٹی

جرم وسزا اور سراغرسانی کی بے مثال چار سچی کہانیاں

احمد یار خان

فہرست

زن، ضمیر اور زہر	۷
قاضی کی کوٹھڑی اور کنواری بیٹی	۷۷
وہ اغوا کرنے آئے تھے	۱۲۵
ساس، سوتیلی ماں اور سرسوں	۱۷۷

پیش لفظ

محترم احمد یار خان کی تفتیشی کہانیوں کا سترھواں مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔

چار کہانیوں کے اس مجموعے میں آپ مصنف کو حسبِ معمول زندہ و بیدار اور تفتیش اور سراغرسانی میں سرگرم عمل دیکھیں گے۔

حقیقی زندگی کی یہ ڈرامائی داستانیں اُس وقت کی ہیں جب پاکستان معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا اور برِ صغیر ایک تھا۔ اب درمیان میں ایک سرحد بن جانے سے برِ صغیر دو ملکوں میں تقسیم ہو گیا ہے مگر رسم و رواج، اقدار اور سوچ و فکر کے لحاظ سے معاشرہ پاکستانی اور ہندوستانی نہ بن سکا۔ ہمارے خیالوں میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ چھوٹی چھوٹی باتیں جس طرح تقسیم سے پہلے بڑی بڑی وارداتوں کا باعث بن جایا کرتی تھیں وہ آج بھی بن رہی ہیں۔ معاشرے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں کہ محترم احمد یار خان کی کہانیاں پرانی ہو گئی ہیں۔ یہ ڈرامے آج بھی کھیلے جا رہے ہیں۔ تبدیلی صرف یہ آئی ہے کہ پرانے زمانے میں پولیس دیانت داری اور جانفشانی سے سراغرسانی کرتی اور مجرموں کو پکڑ کر سزا دلاتی تھی اور آج پولیس "مک مکا" کر کے معاملہ گول کر جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جرائم بڑھتے جا رہے ہیں۔

یہ کہانیاں پڑھیں۔ آپ کو کھرے کھوٹے کا اندازہ ہو جائے گا۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

زن، ضمیر اور زہر

قتل کی یہ واردات میرے تھانے کی نہیں تھی۔ اُس وقت میرا کوئی تھانہ نہیں تھا۔ اس واردات کی تفتیش میرے پاس کس طرح آئی؛ اس سوال کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ سمجھ لیں کہ میں سی۔ آئی۔ اے کے ساتھ تھا اور ایسی وجوہات پیدا ہو گئی تھیں کہ یہ تفتیش سی۔ آئی۔ اے کے سپرد کر دی گئی۔

میں نے شاید پہلے بھی کسی کہانی میں آپ کو بتایا تھا کہ کسی واردات کی رپورٹ تھانے میں آتی ہے تو کچھ کاغذی کارروائی کی جاتی ہے اور جب تفتیش شروع ہوتی ہے تو بھی رجسٹروں اور کاغذوں کے پیٹ بھرے جاتے ہیں۔ ایک فائل بنتی ہے۔ تفتیش کرنے والا افسر انسپکٹر ہو، سب انسپکٹر یا اسسٹنٹ سب انسپکٹر ہو یا کوئی بھی ہو، اُس کا تھانے سے بغرضِ تفتیش نکلنا اور واپس آنا کاغذات میں لکھا جاتا ہے۔ اگر تفتیش کا تعلق کسی دوسرے تھانے کے ساتھ بھی ہے اور ایک دو ملزموں کو اُس تھانے کے علاقے سے گرفتار کرنا ہے تو اس کے لئے الگ قاعدے قانون ہیں اور کچھ دفتری کارروائیاں کی جاتی ہیں۔ میں ضروری نہیں سمجھتا کہ یہ کاغذی اور دفتری کارروائیاں بھی ہر کہانی کے ساتھ بیان کی جائیں۔ اگر میں یہ بھی بیان کرنے لگوں تو ہر کہانی دُگنی لمبی ہو جاتے اور آپ کو بوریت کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہو۔ میں صرف کہانی سنایا کرتا ہوں۔ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ آپ کو صرف کہانی کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ آپ کی دلچسپی نہیں ہونی چاہیئے کہ میں کسی تھانے کا انچارج تھا یا کہیں اور تھا اور فلاں واردات کی تفتیش میرے ہاتھ میں کس

طرح آتی۔ میں یہ بات اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اُن صاحبان کو جو پولیس میں ہیں یا جو پولیس کی کارروائیوں کو سمجھتے ہیں، یہ شک نہ رہے کہ میں جھوٹ موٹ کے قصے گھڑ کر :: اتار ہتا ہوں۔

وہ ہندوستان کا ایک بڑا شہر تھا۔ اُس وقت بھی بڑا تھا، آج کل تو بہت بڑا ہے۔ وہاں کا ایک مسلمان خاندان تھا۔ میں ان لوگوں کی شناخت پر پردہ ڈالنے کے لئے شہر کا نام نہیں لکھوں گا اور مردوں اور عورتوں کے نام صحیح نہیں لکھوں گا کیونکہ اس خاندان کے تمام یا بعض افراد آزادی کے بعد پاکستان میں آگئے ہوں گے۔

اس خاندان پہ پنجاب کا یا ایسے کہہ لیں کہ پنجابیت کا زیادہ اثر تھا اور یہ بہت امیر خاندان تھا۔ شہر میں ان لوگوں کے بہت سے مکان اور دکانیں کرائے پر چڑھی ہوتی تھیں اور شہر سے سَو سوا سَو میل دُور سینکڑوں ایکڑ زرخیز اراضی تھی۔ اس علاقے میں فوجیوں کو حکومت برطانیہ نے اراضی کے مربعے بطور انعام دے رکھے تھے۔ وہاں غیر فوجیوں کی بھی اراضی تھی۔ اس خاندان کے لوگ شہر میں رہائش پذیر تھے اور ان کے مکان کبھی کبھار کی عارضی رہائش کے لئے اراضی پر بھی تھے۔ اس خاندان کا ایک آدمی جس کا میں نام خالد رکھوں گا، چار پانچ دن بیمار رہ کر مر گیا۔ اُس کی عمر تیس سال سے زیادہ تھی۔ اُس کی بیوی تھی اور ایک بچہ جس کی عمر سات سال کے لگ بھگ تھی۔ خالد اپنی بیوی اور اس بچے کے ساتھ الگ مکان میں رہتا تھا۔

وہ جب مر گیا تو اُس کا باپ، بھائی وغیرہ تھانے گئے اور یہ رپورٹ دی کہ خالد طبعی موت نہیں مرا بلکہ اُسے زہر دیا گیا ہے۔ یہ لوگ چونکہ تعلیم یافتہ تھے اور سوسائٹی میں اونچی پوزیشن کے لوگ تھے اس لئے وہ کچھ شہادت اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ انہوں نے دو ڈاکٹروں اور ایک حکیم کے نام اور پتے دیئے جنہوں نے خالد کا علاج کیا تھا۔ تھانہ انچارج نے دونوں ڈاکٹروں اور حکیم کو تھانے بلایا اور ان کی رائے لی کہ وہ مقتول کا علاج کس تشخیص پر کرتے رہے ہیں۔ اُس نے ان تینوں سے الگ الگ رپورٹ لی۔

دونوں ڈاکٹروں کی رپورٹ تقریباً ایک جیسی تھی، لیکن دونوں اس

شک میں تھے کہ تشخیص صحیح نہیں ہوتی۔ ان کے بیانات کے مطابق خالد معدے اور جگر کے مقام پر تلخی کی شکایت کرتا تھا۔ یہ دولت مند لوگ تھے۔ اپنے مریض کو بہت جلد صحت یاب کرنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹروں کا علاج ہو رہا تھا اور وہ حکیم کو بھی گھر لے آتے۔ مریض کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔

حکیم کی رپورٹ یہ تھی کہ پہلے اُسے یہ شک ہُوا کہ مریض پر یرقان کا حملہ ہُوا ہے لیکن علامات ذرا مختلف ہو گئیں تو حکیم کو شک ہُوا۔ اُس نے تھانہ انچارج کو بتایا کہ وہ ایسی بات اپنی زبان سے نہیں کہنا چاہتا تھا، لیکن اُس کا شک پختہ تھا کہ مریض کو زہر دیا گیا ہے یا اُس نے غلطی سے کوئی زہریلی چیز کھا لی ہے۔ حکیم نے زہر کو مارنے کی دوائی بھی دی لیکن مریض بچ نہ سکا۔

تھانہ انچارج نے اپنی تسلی کر کے لاش اپنے قبضے میں لے لی اور پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا دی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا گیا کہ مقتول کو زہر دیا گیا ہے۔ معدے، جگر وغیرہ کے ٹکڑے ماہرین کے پاس بھی بھیج دیئے گئے۔ ان کی رپورٹ تیسرے دن آئی جس میں زہر خورانی کی تصدیق کی گئی تھی۔ زہر کا اثر کچھ دیر بعد شروع ہُوا تھا اور اس نے اپنا پورا اثر پانچ دنوں میں دکھایا۔

اب خالد مقتول تھا۔ اُس کے باپ اور بھائیوں وغیرہ نے اُس کی بیوی پر شک لکھوایا تھا۔ تھانہ انچارج نے ڈیڑھ دو ہفتے تفتیش کی۔ پھر یہ کیس ہمارے پاس آگیا۔ میں جب اس واردات کی تفتیش کے لئے متعلقہ تھانے میں پہنچا تو مقتول کو مرے سترہ اٹھارہ روز گزر چکے تھے۔

میں نے جب متعلقہ سب انسپکٹر سے واردات کی تفصیلات زبانی سُنیں اور فائل دیکھی تو یہ راز کھُلا کہ اُس نے دونوں طرف سے رشوت لی ہے یا دونوں پارٹیوں سے اتنا مرعوب ہوتا رہا ہے کہ تفتیش کو صحیح لائن پر نہیں چلا سکا۔ اُس نے مقتول کی بیوی کو مشتبہ کی حیثیت میں شاملِ تفتیش کیا تھا اور تفتیش کو کچھ آگے بڑھایا تھا۔ اس عورت کا خاندان بھی دولت مند اور اثر و رسوخ والا تھا۔ بہر حال وجوہات ایسی پیدا ہو گئیں کہ یہ کیس ہمارے پاس آگیا۔ تفتیش

کا انچارج میں ہی تھا۔ میرے ساتھ ایک ہندو اے۔ایس۔آئی اور ایک مسلمان ہیڈ کانسٹیبل تھا۔

میں نے سب سے پہلے مخبروں کی اور دو تین معزز مخبروں کی رپورٹوں پر غور کیا۔ تھانہ انچارج نے میرے کہنے پر انہیں پھر بلا لیا تھا۔ ان سب سے رپورٹیں لینے میں ایک دن اور رات کا کچھ حصہ گزر گیا۔ ان سے یہ پتہ چلا کہ مقتول خوبرو آدمی تھا۔ دولت مند بھی تھا اور خاصا عیاش آدمی تھا۔ میاں بیوی میں اکثر لڑائی جھگڑا اور ناچاقی رہتی تھی۔ بیوی خاوند کے پاس اتنا زیادہ نہیں رہتی تھی جتنا اپنے ماں باپ کے گھر رہتی تھی۔ وہ بھی ستائیس اٹھائیس سال کی عمر کی پُرکشش عورت تھی اور ہوشیار بھی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ عورت چال چلن کی تو بُری نہیں تھی لیکن قریباً دو سال پہلے اُس نے اپنی برادری کے ایک آدمی کے ساتھ تعلقات پیدا کر لئے تھے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ تعلقات صرف دوستی کی حد تک تھے یا ناجائز تھے۔

تھانہ انچارج نے اس آدمی کو بھی شاملِ تفتیش کیا تھا لیکن جب بھی اُسے تھانے طلب کیا تو یہ جواب آیا کہ وہ شہر سے باہر گیا ہُوا ہے۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ تفتیش نہ ہونے کے برابر ہوتی تھی اور اب یہ سارا کام میں نے الف سے شروع کرنا تھا۔ مجھے یہ سہولت حاصل تھی کہ میری برانچ کو اتنے اختیارات حاصل تھے جنہیں لامحدود بھی کہا جا سکتا ہے۔ میں نے تفتیش شروع کر دی۔ مقتول کی بیوی اور اُس کے دوست کو معلوم نہیں تھا کہ تفتیش ازسرِنو شروع کرنے کے لئے کوئی اور آ گیا ہے۔ وہ دونوں شاید خوش ہو رہے ہوں گے کہ تفتیش ڈھیلی پڑ گئی ہے اور یہ واردات عدم پتہ قرار دے دی جائے گی۔ میں نے اپنے اے۔ایس۔آئی اور ہیڈ کانسٹیبل کو تھانے کے ایک ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ مقتول کی بیوہ اور اُس کے دوست کو تھانے لانے کے لئے بھیج دیا۔ میں نے انہیں کہا تھا کہ ان میں سے کوئی گھر نہ ملے تو اُس گھر کے کسی ذمہ دار آدمی کو ساتھ لے آئیں اور وہاں تھانے کا یہ پیغام دے آئیں کہ مطلوبہ ہر فرد کو تھانے فوراً پیش نہ کیا گیا تو قانونی کارروائی کی جائے گی۔

چونکہ میرے آدمی اچانک جا پہنچے تھے اس لئے مقتول کی بیوہ جس کا نام پروین تھا، گھر میں ہی مل گئی۔ وہ ابھی اپنے خاوند کے گھر میں تھی اور اُس کا دوست بھی اُس کے گھر میں مل گیا۔ میرے آدمی جب ان دونوں کو ساتھ لانے کے لئے جا چکے تھے، مجھے یاد آ گیا کہ مقتول کے بیٹے کو بھی ساتھ لانا تھا جس کی عمر سات سال کے لگ بھگ بتائی گئی تھی۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو پیچھے دوڑایا کہ وہ اس لڑکے کو بھی ساتھ لے آئے۔

آشنائی بہت گہری تھی

تینوں آ گئے۔ میں نے تفتیش اپنے ہیڈ کوارٹر میں کرنی تھی جو اسی شہر میں تھا لیکن میں کچھ وقت تھانے میں گزارنا بہتر سمجھتا تھا۔ میں نے سب سے پہلے مقتول کے بیٹے کو اپنے پاس بٹھایا۔ اُس کے ساتھ پیار محبت کی باتیں کیں۔ وہ دوسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ اُس سے اُس کے سکول کی باتیں پوچھیں اور اس طرح اُسے اپنے ساتھ بے تکلف کر کے اُس کے ماں باپ کے آپس کے تعلقات پوچھے۔ وہ بچہ تھا پھر بھی میں نے اپنے شک کے مطابق اُس سے کچھ کام کی باتیں معلوم کر لیں۔ اُس نے بتایا کہ اُس کی ماں اُس کے باپ کے ساتھ لڑتی جھگڑتی رہتی تھی۔

"تمہارے ابو تمہاری امی کو مارتے پیٹتے نہیں تھے؟" —— میں نے پوچھا۔

"ایک بار ابو نے امی کو بہت مارا تھا" —— بچے نے جواب دیا —— "پھر امی نانا ابو کے پاس چلی گئی تھی اور بہت دنوں بعد واپس آئی تھی۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

بچے نے جو جواب دیا اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ پندرہ سولہ دن پہلے کا واقعہ ہے۔ بچہ ابھی ہفتوں اور مہینوں کا حساب اچھی طرح نہیں بتا سکتا تھا۔ میں نے اُس کے ساتھ بہت باتیں کی تھیں اور پیار بھی بہت کیا تھا تاکہ کوئی

میرے مطلب کی بات اُس کے مُنہ سے نکلے۔ ان باتوں میں میرا ایک سوال یہ بھی تھا کہ اُسے ابّو اچھے لگتے تھے یا امّی۔ بچہ ذہین تھا اور وہ میرے ساتھ بے تکلف ہو گیا تھا۔

"دونوں اچھے لگتے ہیں" — اُس نے جواب دیا — "لیکن امّی کہتی ہیں کہ ابّو کو اچھا نہ کہا کرو۔ وہ کہتی ہیں کہ چچا افتخار کو اچھا کہا کرو۔"

افتخار وہی شخص تھا جس کے ساتھ پروین کی دوستی بیان کی گئی تھی۔ وہ اس لڑکے کا چچا نہیں تھا نہ اس کا مقتول کے ساتھ خون کا کوئی رشتہ تھا۔

"چچا افتخار تمہارے گھر آتے رہتے ہیں؟" — میں نے پوچھا۔

"ہاں جی!" — بچے نے جواب دیا — "کبھی کبھی آتے ہیں اور میرے لئے بڑی اچھی چیزیں لاتے ہیں۔"

"تمہارے ابّو بھی اس وقت گھر میں ہوتے تھے؟"

"نہیں" — بچے نے جواب دیا — "چچا افتخار اُس وقت آتے تھے جب ابّو زمین پہ گئے ہُوتے ہوتے تھے۔"

پولیس والوں کو چونکہ ایک خاص بات معلوم کرنی ہوتی ہے اس لئے وہ گھما پھرا کر اُس بات پر آتے ہیں۔ پولیس کے اس انداز کو عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ یہ ایک خاص طریقہ ہوتا ہے جو ٹریننگ اور تجربے سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ یہ بچہ تھا۔ بیچارہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ میں کیا جال پھینک رہا ہوں۔ اس کی باتوں سے یہ ثابت ہو گیا کہ پروین کی آشنائی یا دوستی افتخار کے ساتھ بہت گہری تھی۔ یہاں تک پتہ چل گیا کہ دو تین بار افتخار مقتول کی غیر حاضری میں بھی رات کو بھی پروین کے پاس آیا ہے۔

افتخار کے ساتھ بات ہوئی تو اُس نے جیسے محسوس ہی نہ کیا ہو کہ میں ایک شخص کے قتل کی تفتیش کر رہا ہوں اور وہ مشتبہ ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ پروین کے ساتھ اُس کے قریبی مراسم ہیں تو اُس نے ان الفاظ میں جواب دیا — "عجیب بکواس ہے۔"

"افتخار بھائی!" — میں نے شگفتہ سے لہجے میں کہا — "میں آپ کو

تعلیم یافتہ اور معزز آدمی سمجھا تھا لیکن آپ اچھے خاصے گنوار معلوم ہوتے ہیں" — میں نے اُس سے اپنا تعارف کرایا اور کہا — "ذرا ہوش میں آئیں۔ بڑے شوق سے جھوٹ بولیں۔ مجھے گمراہ کرنے کی ہر ترکیب استعمال کریں لیکن سوچ سمجھ کر، اور کوشش کریں کہ میں آپ کی عزت کرتا رہوں۔"

"لیکن مجھے آپ نے کیا سمجھ کر بلایا ہے؟" — اُس نے پوچھا۔

"مشتبہ سمجھ کر" — میں نے جواب دیا — "ویسا ہی مشتبہ جیسا چوری کی واردات میں ہوتا ہے، لیکن جناب قتل کی واردات میں مشتبہ ہیں .... آپ مقتول کی غیر حاضری میں رات کے وقت کتنی بار اُس کی بیوی سے ملنے گئے ہیں؟"

"ایک بار بھی نہیں" — اُس نے جواب دیا۔

"تم جھوٹ کہہ رہے ہو" — میں نے اُسے ٹھکانے پر لانے کے لئے آپ کی بجائے تم کہنا شروع کر دیا اور کہا — "کوئی بھی لفظ جو تم یہاں مُنہ سے نکالو گے وہ عدالت میں تمہارے خلاف استعمال ہو گا۔ تم اپنے آپ کو بچا نہیں پھنسا رہے ہو۔"

وہ ٹھنڈا پڑنے لگا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں اُسے اپنے ہیڈ کوارٹر میں لے جاؤں گا اور وہاں اُس کے ساتھ جو سلوک ہو گا اسے وہ تصوّر میں بھی نہیں لا سکتا اور اگر وہ وہاں مر بھی گیا تو ہم سے کوئی باز پُرس نہیں کرے گا۔ ہم اپنے بچاؤ کے طریقے جانتے ہیں۔

میں نے اسی طرح جب اپنا آپ اُسے دکھایا تو وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور اُس نے تسلیم کر لیا کہ پروین کے ساتھ اُس کے تعلقات ہیں جو ڈیڑھ پونے دو سال پہلے شروع ہُوتے تھے۔ اُس نے میرے بہت سے سوالوں اور جرح کے بعد یہ بھی مان لیا کہ پروین اپنے خاوند سے تنگ تھی اور طلاق تک سوچ چکی تھی۔

افتخار نے میری بہت سی مغز کھپائی کے بعد یہ بھی تسلیم کر لیا کہ وہ پروین کی خاطر اپنی بیوی کو طلاق دینے پر آ گیا تھا لیکن یہ معاملہ اس طرح آگے بڑھانا تھا کہ پہلے پروین مقتول سے طلاق لے، لیکن مقتول طلاق دینے پر آمادہ نظر نہیں

آتا تھا۔

"کیا پروین نے مقتول سے طلاق کا مطالبہ کیا تھا؟"

"نہیں" — افتخار نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا — "وہ ایسی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔"

"پھر تمہیں کیسے پتہ چلا کہ مقتول طلاق دینے پر آمادہ نہیں تھا؟"

میرا یہ سوال سن کر افتخار کے چہرے پر گھبراہٹ سی آگئی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے پاس کوئی جواب نہیں یا وہ غلط جواب دینے کی سوچ رہا ہے۔

"افتخار میاں!" — میں نے کہا — "میں اپنے سوال کا جواب خود ہی دے دیتا ہوں۔ پروین نے طلاق مانگی تھی اور مقتول نے انکار کرنے کی بجائے اس کی پٹائی کر دی تھی اور یہ دو اڑھائی ہفتے پہلے کا واقعہ ہے۔"

"مجھے معلوم نہیں" — افتخار نے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے" — میں نے کہا — "اور یہ بھی سوچ لو کہ میں نے ابھی پروین سے بھی کچھ پوچھنا ہے۔ اس کے جواب تمہارے جوابوں سے ملاؤں گا۔ بال برابر بھی فرق ہوا تو تم دونوں حوالات میں بند ہو جاؤ گے اس لئے میں تمہیں راستہ دکھاتا ہوں۔ اپنے جرم کا اقبال کر لو۔ اگر مجھے تفتیش کی مزید پریشانی سے بچاؤ گے تو میں تمہیں بری ہونے کا راستہ دکھا دوں گا۔ کوئی عینی شاہد نہیں ہے۔ صرف یہ ثابت ہوا ہے کہ مقتول کو زہر دیا گیا ہے۔"

اس نے ہر مشتبہ کی طرح قسمیں کھانی شروع کر دیں اور یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اس واردات کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں، بہت کچھ کہا، میری منت سماجت بھی کی کہ میں اس پر صرف اس وجہ سے شک نہ کروں کہ اس کی پروین کے ساتھ دوستی ہے۔ پولیس کی مجبوری یہ ہے کہ قسموں پر یا کسی کے آنسوؤں پر یا کسی کی منت سماجت پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ ثابت کر دے کہ اس نے پروین کے ساتھ مل کر مقتول کو زہر نہیں دیا۔

"صاحب، میں کیسے ثابت کروں" — اس نے رندھی ہوئی آواز میں

کہا — "اگر آپ کے پاس میرے خلاف کوئی شہادت ہے تو اس پر مجھے گرفتار کر لیں۔"

"میں گرفتاری کے بغیر ہی تمہیں جب تک ضرورت محسوس کروں گا، اپنے پاس رکھوں گا" — میں نے کہا — "تم میری بات نہیں سمجھ رہے۔ بہتر ہے کہ تم باہر بیٹھ جاؤ اور اپنا اچھا برا سوچ لو۔"

میں نے اسے باہر بھیج دیا اور پروین کو اندر بلا لیا۔

وہ جذباتی ہو گئی تھی

پروین کے چہرے کی خوبصورتی تو اپنی جگہ تھی لیکن اس کے لمبوترے قد اور جسم کی ساخت میں زیادہ کشش تھی۔ میں حیران تھا کہ اس حسین عورت کا خاوند عیاش تھا اور وہ دوسری عورتوں کے پیچھے جھک مارتا پھرتا تھا۔ اسی سے میں نے اندازہ کر لیا کہ مقتول اخلاقی لحاظ سے بہت پست تھا۔ میں نے پروین کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ مجھے غم کا وہ تاثر نظر نہ آیا جو ایک بیوہ کے چہرے پر ہوا کرتا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ ہمدردی اور اپنائیت کی باتیں کیں تاکہ وہ گھبراہٹ سے نکل سکے۔

"پروین!" — میں نے کہا — "باقی باتیں تو ہوتی رہیں گی، برا نہ جانو تو ایک بات کہوں .... جسے تم جیسی بیوی مل جاتی وہ تو ساری دنیا کو بھول جاتا۔ معلوم ہوتا ہے خالد گناہوں میں ڈوب گیا تھا۔ کمبخت اندھا ہو گیا تھا جو تمہاری قدر نہ کر سکا۔"

اس نے آہ بھری اور سر جھکا لیا۔

"کیا وہ شروع سے ہی ایسا تھا؟" — میں نے پوچھا۔

"شروع سے ہی!" — پروین نے جواب دیا — "بزرگوں کا فیصلہ تھا کہ میری شادی اسی کے ساتھ ہو گی۔"

"معلوم ہوتا ہے افتخار کے ساتھ تمہاری دوستی انتقامی کارروائی ہے"

—— میں نے کہا —— "یہ قدرتی معاملہ ہے۔ میں تمہاری مجبوری کو سمجھتا ہوں"۔
اُس نے مجھے یوں چونک کر دیکھا جیسے میں نے اُسے بے خبری میں سوئی چبھو دی ہو۔

"میں بھی انسان ہوں پروین!" —— میں نے کہا —— "انسانی جذبات کو سمجھتا ہوں .... کہیں ایسا تو نہیں کہ تم افتخار کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھیں لیکن خالد کے ساتھ ہو گئی؟ میرا خیال ہے تم نے خالد کو دل سے قبول نہیں کیا تھا"۔

اُس کی تو جیسے زبان اکڑ گئی تھی۔ بولتی ہی نہیں تھی۔

"پروین!" —— میں نے اُس کے سر کو اپنے ہاتھ سے ذرا ہلا کر کہا —— "کہاں کھو گئی ہو! مجھے تمہارے حالات کا علم ہے۔ تم شاید حیران ہو رہی ہو کہ تمہارے راز مجھ تک کیسے پہنچ گئے ہیں۔ تم تعلیم یافتہ ہو۔ جاسوسی ناول اور کہانیاں پڑھتی ہو گی۔ میں انہی کہانیوں والا سراغرساں ہوں۔ زمین میں دفن کئے ہوئے راز بھی نکال لیا کرتا ہوں۔ کہہ دو میں غلط کہہ رہا ہوں"۔

وہ پھر بھی چُپ رہی۔

"کیا تم نے دیکھا نہیں کہ میں نے تمہارے بچے کو اپنے پاس بٹھاتے رکھا ہے؟" —— میں نے کہا —— "اور تم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ افتخار سے میں نے اڑھائی گھنٹے پوچھ گچھ کی ہے۔ وہ عقل والا ہے۔ میری بات سمجھ گیا تھا۔ اُس نے کوئی راز نہیں رہنے دیا۔ تم بھی پردہ اٹھا دو۔ کئی باتیں تو تمہارے بچے کے مُنہ سے میں نے کہلوا لی ہیں۔ اب میں تمہاری زبان سے کچھ سُننا چاہتا ہوں"۔

"کیا آپ کو یہ شک ہے کہ اپنے خاوند کو میں نے زہر دیا ہے؟" —— اُس نے کہا۔

"نہیں پروین!" —— میں نے کہا —— "سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تم نے اپنے خاوند کو زہر نہیں دیا لیکن میں تمہارے تعاون کے بغیر یہ کیسے ثابت کر سکتا ہوں"۔

"مجھے بتائیں!" —— اُس نے کہا —— "آپ کو کیسے تعاون کی ضرورت ہے"۔

"میں جو کچھ پوچھوں وہ سچ سچ بتا دو" —— میں نے اُس کی طرف جھک کر کہا —— "میری تمہارے ساتھ کیا دشمنی ہے؟ بلکہ میری ہمدردیاں تو تمہارے ساتھ ہیں۔ مظلوم تم ہو۔ یہ تو میں بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ طوائفوں کے کوٹھوں پر جانے والا خاوند تم جیسی بیوی کو مارے پیٹے .... افتخار کے ساتھ جو تمہاری دوستی ہے، اس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ قانون کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کرو۔ تم اب عدت پوری کر کے آسانی سے افتخار کے ساتھ شادی کر سکتی ہو لیکن میرا شک رفع کر دو۔ چونکہ افتخار نے سب کچھ بتا دیا ہے، تم بھی بتا دو۔ میں تمہیں بچا لوں گا"۔

"میں نے یا افتخار نے خالد کو زہر نہیں دیا" —— پروین نے کہا —— "وہ زمینوں پر گیا ہُوا تھا۔ ڈیڑھ مہینہ وہاں رہا۔ واپس آیا تو اُسی رات اُسے یہ تکلیف شروع ہوئی جس سے وہ فوت ہُوا ہے .... اُس کے ساتھ میرے تعلقات تو کئی سالوں سے ٹھیک نہیں تھے۔ زہر دے کر مارنا ہوتا تو پہلے ہی اُسے زہر دے دیتی"۔

"تمہاری یہ باتیں مجھ پر اثر نہیں کر رہیں" —— میں نے کہا —— "افتخار کے ساتھ تمہارے تعلقات تھوڑے ہی عرصے سے شروع ہوتے تھے۔ اس کے ساتھ شادی کرنے کے لئے تم نے خالد سے طلاق مانگی تھی لیکن اُس نے تمہیں مارا پیٹا۔ اس کے بعد یہی ایک طریقہ رہ گیا تھا کہ خالد کو زہر دے دیا جاتے۔ افتخار کے لئے اپنی بیوی کو طلاق دینا مشکل نہیں تھا"۔

"آپ بار بار میرے اور افتخار کے تعلقات کی بات کرتے ہیں" —— اُس نے کہا —— "خالد نے کئی عورتوں کے ساتھ جو تعلقات بنا رکھے تھے، اُن کا آپ نام نہیں لیتے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ وہ کس قماش کا آدمی تھا۔ مجھے پتہ چلتا رہتا تھا کہ وہ باہر کیا کر رہا ہے۔ اپنی زمینوں پر جا کر بھی وہ عیاشیاں کرتا تھا۔ میں تو کہتی ہوں کہ اُسے وہیں کسی نے زہر دے دیا تھا جس کا اثر گھر آ کر ہُوا"۔

میں آپ کو مکالمے ہی نہیں سناتا رہوں گا۔ کہانی کو آگے بڑھاؤں گا۔

سوال اور جرح کر کر کے میں نے پروین کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ آپ یوں سمجھیں کہ وہ جس طرف سے بھی نکلنے کی کوشش کرتی تھی، میں اُسے آگے سے روک لیتا تھا۔ اپنے بعض سوالوں کا اُس سے جواب سن کر میں ویسے ہی کہہ دیتا کہ افتخار نے تو مجھے کچھ اور بتایا ہے۔ وہ آخر اس قدر تنگ آگئی کہ کہنے لگی کہ وہ سارے حالات سنا دیتی ہے۔ اُس نے اُس دن سے بات شروع کی جس دن وہ خالد کی دلہن بن کر آئی تھی۔

"اُس پہلی رات بھی اُس کے مُنہ سے شراب کی بُو آرہی تھی" —— پروین نے کہا —"اُس نے کوئی جذباتی یا رومانی بات نہ کی۔ اُس وقت اُس کی عمر بائیس یا تیئس سال تھی لیکن وہ پختہ کار بدمعاش لگتا تھا۔ بخدا میں ایسے محسوس کرنے لگی تھی کہ میں طوائف ہوں اور یہ میرا گاہک ہے۔ میں تو کچھ اور ارمان لے کر آئی تھی۔ میں نے اُس کے ساتھ جذباتی باتیں کیں جن کی اُس نے ذرا سی بھی قدر نہ کی ....

"تین چار دنوں میں ہی مجھے پتہ چل گیا کہ یہ مجھے اپنی داشتہ سمجھتا ہے۔ کچھ دن مجھے سیر سپاٹے کے لئے لے جاتا رہا۔ زمینوں پر بھی لے گیا۔ وہ جگہ مجھے زیادہ اچھی لگی۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا اور خالد نے وہاں بڑا خوبصورت مکان بنایا ہُوا ہے۔ پھر وہ مجھے زمینوں پر تین چار بار لے گیا۔ ہر بار وہاں پندرہ بیس دن رہے اور آگئے۔ یہ پہلے پانچ چھ سالوں کی بات ہے۔ چار سال گزر گئے ہیں، وہ مجھے وہاں نہیں لے گیا۔ خود جاتا تھا اور ڈیڑھ دو مہینے گزار کر آتا تھا.....

"وہ اس شہر میں جو کچھ کرتا تھا وہ مجھے جلدی ہی معلوم ہو گیا تھا۔ انیسہ اور نجمہ یہاں کی مشہور گانے اور ناچنے والیاں ہیں۔ کچھ عرصے سے ان کے ہاں جاتا تھا۔ سُنا ہے نجمہ بہت خوبصورت ہے اور خالد اُس کا عاشق بنا ہُوا ہے۔ یہ بھی سُنا ہے کہ خالد جیسا ایک اور شہزادہ بھی نجمہ کا ہی چاہنے والا ہے اور ان کی آپس میں رقابت پر لڑائی بھی ہوتی تھی اور شاید ان کی آپس میں دشمنی بھی چلتی رہی ہے۔ آپ اگر معلوم کرنا چاہیں تو خالد کے دوستوں سے معلوم کر سکتے ہیں، اور اگر آپ میری رائے پر دھیان دیں تو میرا شک یہ ہے کہ اُسے اسی رقابت اور دشمنی میں زہر دیا گیا ہے۔ آپ اپنا سارا زور مجھ پر اور افتخار پر لگاتے جا

رہے ہیں۔ یہ بھی دیکھیں کہ اُس کی باہر کی زندگی کیسی تھی"۔

اُس نے مجھے خالد کے تین دوستوں کے نام بتائے جو میں نے نوٹ کر لئے۔ اُس نے ایک بار پھر کہا کہ زمینوں پر جا کر وہ عیش و عشرت کرتا تھا، وہاں جا کر اس کی بھی تفتیش کریں۔ میں نے جب دیکھا کہ وہ بولنے پر آگئی ہے تو میں نے اُس کی حوصلہ افزائی شروع کر دی اور اُس کا ہمدرد بن گیا۔

"پروین!" —— میں نے کہا —"میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ میرے دل میں تمہاری اور افتخار کی کوئی دشمنی نہیں۔ اگر خالد کے باپ وغیرہ نے کہہ دیا ہے کہ خالد کو تم نے زہر دیا ہے تو اُن کے کہنے پر ہی تمہیں اور افتخار کو گرفتار نہیں کر لوں گا۔ میں اپنا شک رفع کر رہا ہوں۔ تم بڑے کام کی باتیں بتا رہی ہو۔ میں ہر اُس جگہ جاؤں گا جو تم بتاؤ گی اور ہر اُس مرد یا عورت کو شاملِ تفتیش کروں گا جس کا نام لو گی۔ تم مجھے اپنے اور افتخار کے تعلقات کی تفصیل سنا دو لیکن جھوٹ نہ بولنا اور کچھ چھپانا نہیں۔ میرے سوا ان باتوں سے کوئی بھی واقف نہیں ہو سکے گا۔ افتخار تو سُنا ہی چکا ہے، تم بھی سنا دو"۔

"میں اپنے خاوند سے تنگ آگئی تھی" — اُس نے کہا —"میں نے اپنے ماں باپ سے کہہ دیا تھا کہ اس سے مجھے طلاق دلاؤ ورنہ میں خودکشی کر لوں گی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ قصوروار کون ہے، طلاق ہوتی ہے تو بدنام صرف عورت ہوتی ہے۔ عورت پر توپ کا یہ گولہ داغا جاتا ہے کہ وہ خاوند سے بے وفائی کرتی تھی اس لئے اسے طلاق ہو گئی ہے، پھر اُسے کوئی بھی اپنی بیوی نہیں بناتا .... ماں باپ نے مجھے خاندان کی عزت اور آبرو کا واسطہ دے کر چُپ کرا دیا اور میں خالد کے سلوک کو سہتی رہی"۔

"لیکن پروین!" — میں نے کہا —"تمہارا بچہ کیوں کہتا ہے کہ امی ابو کے ساتھ بہت لڑتی تھی؟"

"وہ ٹھیک کہتا ہے" — پروین نے جواب دیا —"بچہ ہے۔ وہ یہی دیکھ سکتا تھا کہ ماں اُس کے باپ سے لڑ رہی ہے۔ یہ بے چارہ یہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اُس کا باپ کس حالت میں گھر آیا ہے۔ کبھی اُس کے کوٹ کے ساتھ کسی

عورت کا ایک آدھ بال چپکا ہوا ہوتا تھا اور کبھی اُس کی قمیض پر سُرخی اور لپ سٹک کا داغ ہوتا تھا۔ میرا بچہ شراب کی بُو سے تو واقف نہیں تھا کہ وہ جان سکتا کہ ماں اُس کے باپ سے کیوں لڑتی ہے۔"

"اُس نے تمہیں کتنی بار مارا پیٹا بھی تھا!" — میں نے کہا۔

"ہاں!" — پروین نے کہا — "میں نے اُس سے طلاق مانگی تھی" — اُس نے بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں سُنا کر کہا — "اس سے آپ اندازہ کریں کہ میں کس جہنم میں پڑی رہی۔ خالد کے چھوٹے بھائی کی شادی ہوتی تو خالد نجمہ اور انیسہ کو لے آیا۔ اُن کا گانا اور رقص ہوا اور خالد نے شراب کے نشے میں ان دونوں پر پیسہ پھینکتے ہوئے ان کے ساتھ جو جو حرکتیں کیں وہ اتنی بے ہودہ تھیں کہ میں آپ کے سامنے بیان نہیں کر سکتی۔ میری ایک سہیلی میرے ساتھ تھی۔ اُس نے کہا — 'پروین! اس سے طلاق لے لو۔ تم کس طرح برداشت کر رہی ہو؟' ....

"وہ ٹھیک کہتی تھی۔ میری برداشت ختم ہو چکی تھی اور میں نے تنہائی میں بیٹھ کر رونا شروع کر دیا تھا۔ ایک روز مجھے خیال آیا کہ میں کیوں اپنی جان کھا رہی ہوں۔ اگر اس شخص کو جھک مار لے کا اور من مانی عیش و عشرت کر لے کا حق حاصل ہے تو میں اس کی زرخرید لونڈی تو نہیں۔ میں آپ کو سچ بتاتی ہوں کہ میں نے ایک دو آدمیوں کے ساتھ ناجائز تعلقات پیدا کرنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن میں اپنے آپ کو بدی پر آمادہ نہ کر سکی۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ میری ذہنی کیفیت کیا ہو گئی تھی۔ میں پاگل پن کے قریب پہنچ گئی تھی ....

"اس ذہنی حالت میں افتخار میرے سامنے آیا۔ میرے خاندان کا آدمی ہے۔ میل ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اپنی بیوی کے ساتھ اس کی نہیں بنتی۔ گھٹے ہوئے ذہن کی عورت ہے۔ اگر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی تو وہ بہت اچھی لگتی لیکن وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ کی بجائے ماتھے پر شکن ڈالے رکھتی ہے۔ وہ دیکھتی نہیں گھورتی ہے۔ افتخار میں کوئی بُری عادت نہیں لیکن بیوی اس پر بڑے گندے الزام لگاتی رہتی ہے ....

"میں جانتی تھی کہ افتخار مجھے دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ ڈیڑھ پونے دو سال گزرے، میں نے افتخار کے ساتھ بے تکلفی پیدا کر لی۔ ہماری تنہائی کی پہلی ملاقات اس طرح ہوئی کہ خالد زمینوں پر گیا ہوا تھا اور میں نے افتخار سے کہا کہ وہ رات کو میرے گھر آئے۔ وہ آ گیا۔ اُس نے مجھے اپنی بیوی کی باتیں سنائیں اور میں نے اپنے خاوند کی سنائیں .... اب آپ بھی ذرا غور کریں۔ کوئی عورت اس طرح سچ نہیں بولا کرتی جس طرح میں بول رہی ہوں۔ میں جلی بھُنی ہوئی عورت ہوں انسپکٹر صاحب! میں بُری نیت سے افتخار کے قریب ہوئی تھی۔ وہ بچہ تو نہیں تھا۔ سمجھ گیا کہ میرا ارادہ کیا ہے۔ میں اپنے جذبات کی تسکین کی خاطر یا انتقام کے خیال سے افتخار کو اپنا خاوند بنانے کا ارادہ کر چکی تھی لیکن وہ پرے ہٹ گیا ....

"میں صاف باتوں پر آ گئی۔ اُس نے کہا — 'یوں نہیں پروین! تم خاوند سے اس لئے تنگ ہو کہ وہ بدکار ہے اور میں اپنی بیوی سے اس لئے تنگ ہوں کہ وہ مجھ پر بدکاری کے جھوٹے الزام لگاتی رہتی ہے۔ اگر ہم دونوں بدکاری پر اتر آتے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم اُن دونوں کی سطح پر آ گئے ہیں۔ ایک سیدھا اور جائز راستہ ہے۔ ہم وہ کیوں نہ اختیار کریں!' ....

"اُس نے میرا ذہن صاف کر دیا۔ وہ کہتا تھا کہ تم اپنے خاوند سے طلاق لے لو اور میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں گا، پھر ہم شادی کر لیں گے۔ بدی نہیں کریں گے۔ پھر ایسے ہی ہوا کہ وہ ارادہ ہمیشہ کے لئے میرے دل سے نکل گیا جس کے لئے میں نے افتخار کو بلایا تھا۔ ہماری محبت پاک رہی ہے۔ ہم تنہائیوں میں ملتے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر بیٹھتے تھے۔ پیار اور محبت کی باتیں کرتے تھے۔ میرے دل میں جو تلخیاں بھر جاتی تھیں وہ نکل جاتی تھیں اور مجھے وہ سکون مل جاتا تھا جس کے لئے میں ترستی رہی تھی۔"

وہ روانی سے بیان دے رہی تھی اور وہ جذباتی بھی ہو گئی تھی۔ اُس نے افتخار کی اور اپنی تنہائی کی باتیں سنائیں جو دلچسپ تھیں لیکن میں اس انتظار میں تھا کہ وہ اسی روانی میں کہہ دے گی کہ خالد کو زہر میں نے دیا ہے اور

زہر افتخار لایا تھا لیکن وہ اس بات پر آ ہی نہیں رہی تھی۔ اُس نے ہر وہ بات کہی جو اُس کے خلاف شک کو پختہ کرتی تھی مثلاً افتخار کے ساتھ روحانی محبت جو اُس کے لئے نشہ بن گئی تھی، اور مقتول سے نفرت اتنی کہ زبان پر اُس کا نام بھی نہیں لاتی تھی۔ پروین روانی میں یہ بھی کہہ گئی کہ کسی کو جان سے مارنے کی مجھ میں جرأت نہیں تھی ورنہ میں اُس کی شراب کی بوتل میں زہر ڈال دیتی۔

مختصر یہ کہ اُس نے اپنے خلاف شک پختہ کر دیا لیکن جرم کا اقبال نہ کیا۔ ایسی وارداتیں تو ہوتی ہی رہتی تھیں اور آج تک ہو رہی ہیں کہ بیوی نے آشنا کے ساتھ مل کر اپنے خاوند کو قتل کروا دیا۔ اکثر قتل زہر سے کئے جاتے ہیں۔ خالد کا قتل بھی اسی نوعیت کا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے پروین کو اقبالِ جرم پر بہت اُکسایا لیکن اُس نے انکار کیا اور انکار پر ہی قائم رہی۔ میں کسی حد تک قائل ہو گیا تھا لیکن ان دونوں کو ابھی الزام سے بری قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔

افتخار اور پروین کو میں نے شاملِ تفتیش رکھا اور انہیں اپنے ساتھ اپنے ہیڈکوارٹر میں لے گیا۔ پیچھے پیچھے دونوں کے باپ اور بھائی وغیرہ آ گئے پھر پولیس ہیڈکوارٹر کا ایک مسلمان پولیس انسپکٹر آ گیا۔ وہ افتخار اور پروین کا سفارشی بن کر آیا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ انہیں کہہ دو کہ اقبالِ جرم کر لیں پھر میں انہیں بری ہونے کا طریقہ بتا دوں گا۔ اس انسپکٹر نے مجھ پر بہت دباؤ ڈالا، یہ بھی کہا کہ میں کچھ لے لوں اور انہیں چھوڑ دوں۔

"ملک صاحب!" ــــ اُس نے کہا ــــ "یہ معزز خاندان ہیں۔ حیثیت اور عزت والے ہیں۔"

"اور ان کی حیثیت اور عزت طوائفوں کے بازار تک پہنچی ہوتی ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "ان کے آدمی شراب پیتے اور بدکاریاں کرتے پھرتے ہیں اور ان کی بیویاں خاوندوں کی غیر حاضری میں غیر مردوں کو گھر بلاتی اور عشق و محبت کے ڈرامے کھیلتی ہیں .... کچھ میری عزت کا بھی خیال کرو میرے بھائی! میرے ساتھ کے انسپکٹر ہو۔ تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟ میرے اُوپر

جو گوری چمڑی والا ڈی۔ ایس۔ پی بیٹھا ہوا ہے، اُسے جانتے ہو؟"

اس انسپکٹر کو میں نے بڑی مشکل سے ٹرخایا۔ واردات والے تھانے کے ایس۔ ایچ۔ او پر اسی قسم کا دباؤ پڑ رہا تھا اور مجھے شک تھا کہ اُس نے دونوں پارٹیوں سے کچھ وصول بھی کر لیا تھا۔

نجمہ رقاصہ نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں

مقتول کا گھر دیکھنا بھی ضروری تھا۔ یہ تو اب ایک رسمی کارروائی تھی۔ کاغذوں کا پیٹ بھرنے کے لئے میں پروین اور اُس کے بچے کو ساتھ لے کر اُس کے گھر چلا گیا۔ ایک شک یہ بھی ذہن میں آیا کہ کسی کے ساتھ جائیداد کا جھگڑا ہی نہ ہو۔ پروین نے بتایا کہ ایسا کوئی جھگڑا نہیں۔ اُس نے مقتول کی جائیداد کے کاغذات مجھے دکھائے۔ جب کاغذات دیکھے تو میں نے ضروری سمجھا کہ مقتول کے دوسرے کاغذات یعنی خطوط وغیرہ بھی گھر میں ہیں تو دیکھ لئے جائیں۔ میرے کہنے پر پروین نے مقتول کا اٹیچی کیس کھولا۔ اُس کی میز کی درازیں بھی دیکھیں اور ایک الماری بھی دیکھی۔

الماری اور درازوں میں سے چند ایک خطوط نکلے۔ میں نے پڑھے۔ یہ سب کاروباری قسم کے خطوط تھے۔ مقتول کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں بھی دیکھیں۔ اُس کی کتابیں بھی کھول کر دیکھیں۔ ان میں سے بھی کوئی ایسا کاغذ برآمد نہ ہوا جو کوئی سراغ دیتا۔ مقتول کے باپ کو اندر بلا کر پوچھا کہ جائیداد کا کوئی تنازعہ ہو گا۔ اُس نے بھی کہا کہ جائیداد بھائیوں میں تقسیم ہو چکی ہے اور کسی کا کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا یا تنازعہ نہیں۔

پروین، افتخار اور بچے کو ساتھ لے کر میں ہیڈکوارٹر چلا گیا اور اُن دونوں ڈاکٹروں اور حکیم کو ایک بار پھر طلب کیا جنہوں نے مقتول کا علاج کیا تھا۔

تینوں کچھ دیر بعد آ گئے۔ یہ بھی ایک رسمی کارروائی تھی۔ پوسٹمارٹم رپورٹ

اور ماہرین کی رپورٹ بالکل صاف تھی کہ موت زہر خورانی سے واقع ہوئی ہے۔

میں نے ان تینوں کے بیانات الگ الگ کر لئے۔ دونوں ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ اسے معدے یا جگر یا پتے کا مرض سمجھتے رہے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ مریض کے کچھ ٹیسٹ لینا چاہتے تھے جس میں خون اور پتے کا ٹیسٹ ضروری تھا لیکن انہیں معلوم ہوا کہ ایک حکیم کا علاج شروع کرا دیا گیا ہے۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے" — میں نے دونوں ڈاکٹروں سے الگ الگ پوچھا — "کہ آپ دوائیاں دیتے رہے، اس کے ساتھ ہی حکیم نے اپنی دوائیاں دینی شروع کر دیں اور دونوں دوائیوں نے مل کر زہر کی صورت اختیار کر لی ہو جو مہلک ثابت ہوا؟"

دونوں ڈاکٹروں نے ایک جیسی رائے دی۔ وہ کہتے تھے کہ وہ حتمی رائے نہیں دے سکتے۔ حکیم کے ساتھ بات ہوئی تو اس نے پورے وثوق سے کہا کہ پہلے وہ اس مرض کو یرقان سمجھا تھا لیکن دوسرے ہی دن نبض کی چال ایسی ہو گئی جس نے حکیم کو شک میں ڈال دیا۔ یہ بڑا قابل اور معمر حکیم تھا۔ اس نے بتایا کہ علامات اور نبض کی چال میں جس تیزی سے تبدیلی ہوئی اور مرنے والے کے چہرے اور آنکھوں کا جس طرح رنگ بدلا، یہ صاف نشانیاں تھیں کہ اس نے خود کوئی زہریلی چیز کھا لی ہے یا اسے کھلائی گئی ہے۔

"کیا اس کا کوئی علاج ہو سکتا تھا؟"

"نہیں" — حکیم نے جواب دیا — "میں مریض کے لواحقین کو بتانا چاہتا تھا کہ اس کی زندگی بمشکل دو دن باقی ہے۔"

بردین نے مجھے خالد کے تین بے تکلف دوستوں کے نام اور پتے لکھوائے تھے۔ میں نے ڈاکٹروں اور حکیم کو بلوانے سے پہلے ان تینوں کی طرف آدمی بھیج دیئے تھے۔ وہ دو تین گھنٹوں بعد آ گئے۔ میں نے ان کے بھی الگ الگ بیان لئے اور پوچھ گچھ کی۔ ہر ایک کے ساتھ میں نے بہت وقت صرف کیا۔

ان تینوں سے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ ان معلومات کی تصدیق کرتی تھیں جو پہلے ہی مجھ تک پہنچ چکی تھیں۔ مقتول کے ان دوستوں نے مجھے اس

کی عیاشیوں کے قصے سنائے۔ کام کی بات یہ معلوم ہوئی کہ رقاصہ نجمہ کا جو دوسرا چاہنے والا تھا وہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ وہ قتل کی ہمت رکھتا تھا۔ یہ تینوں دوست مقتول کے ہم نوالہ اور ہم پیالہ تھے۔ تینوں کی یہ رائے تھی کہ نجمہ رقاصہ ہے اور وہ دونوں کو نچاتی رہی ہے۔

"کیا ایسا ہوا ہو گا کہ نجمہ نے خالد کو شراب میں زہر پلا دیا ہو؟" — میں نے یہ سوال تینوں دوستوں سے کیا۔

ایک نے کہا کہ وہ ایسی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے کاروبار کا معاملہ ہے۔ باقی دو نے ایک جیسی رائے دی۔ وہ کہتے تھے کہ نجمہ آخر طوائف ہے اس کا کیا بھروسہ۔ نجمہ کے دوسرے چاہنے والے کے متعلق ان دونوں نے بتایا کہ اس نے دو تین مرتبہ مقتول کو دھمکی دی تھی کہ وہ نجمہ کے پاس نہ جایا کرے۔

ان تینوں دوستوں نے کام کی دوسری بات یہ بتائی کہ مقتول کی اصل عیاشیاں تو اس مکان میں چلتی تھیں جو اس نے اپنی اراضی میں بنایا ہوا تھا۔ نجمہ اور انیسہ کو وہ وہاں بھی لے جایا کرتا تھا۔ یہ بھی کہ مقتول کا رقیب نجمہ کا مقتول کے ساتھ اتنی دور جانا پسند نہیں کرتا تھا۔

"کیا یہ ہو سکتا ہے کہ اراضی پر مقتول کی کسی کے ساتھ دشمنی یا رقابت ہو جو اس کے قتل کا باعث بنی؟" — میں نے یہ سوال تینوں دوستوں سے پوچھا تھا۔

تینوں کے جواب تقریباً ملتے جلتے تھے جنہیں میں اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کروں گا کہ وہاں مقتول جیسے چند اور عیاش شہزادوں کی بھی زمینیں ہیں۔ وہاں دو گاؤں بھی ہیں۔ اس علاقے میں جو لوگ آباد ہیں ان کی عورتیں اور جوان لڑکیاں بھی ہیں۔ مقتول عورتوں کے معاملے میں خطرے بھی مول لے لیا کرتا تھا۔ یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ مقتول کو وہاں کسی نے زہر دے دیا ہو اور یقین کے ساتھ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اسے وہاں زہر نہیں دیا گیا۔

بردین کی یہ بات پھر سے ذہن میں کھٹک رہی تھی کہ مقتول اراضی پہ

گیا ہوا تھا اور ڈیڑھ دو ماہ بعد واپس آیا اور اُسی شام اُس نے معدے میں درد یا تلخی کی شکایت کی۔ اگر اُسے یہ شکایت رات بہت دیر بعد ہوتی اور اس سے پہلے وہ کہیں باہر گیا ہوتا تو شک کیا جا سکتا تھا کہ وہ نجمہ یا انیسہ کے ہاں گیا تھا اور کسی دشمن نے اُسے شراب میں یا پان میں زہر دے دیا۔

ان دوستوں کو میں نے یہ کہہ کر فارغ کر دیا کہ ان کا ایک جگری یار قتل ہو گیا ہے اس لئے یہ اُن کا فرض ہے کہ اپنے طور پر ٹوہ میں لگے رہیں۔ شاید قاتل کا کوئی سراغ مل جائے۔

آدھی رات کے کچھ بعد کا وقت تھا جب نجمہ رقاصہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بھی پروین کی طرح کشش والی عورت تھی اور اس کی عمر بھی پروین جتنی ہی تھی۔ دوسری رقاصہ جس کا نام انیسہ تھا وہ باہر بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں کے آدمی بھی ساتھ آئے تھے۔ میں نے انہیں کچھ ہی دیر پہلے بلایا تھا۔ دونوں نے آکر سب سے پہلے مجھ سے شکایت کی کہ میں نے انہیں ایسے وقت بلایا ہے جو اُن کے کاروبار کے عروج کا وقت ہوتا ہے۔ میں نے اُن کی شکایت کی کوئی پروا نہ کی اور پہلے نجمہ کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ میں نے مقتول کے رقیب کو بھی بلوایا تھا۔ وہ ابھی نہیں پہنچا تھا۔

نجمہ نے میرے سامنے آکر جو ناز و انداز مجھے دکھائے اور جس طرح مجھے مسحور اور مرعوب کرنے کی کوشش کی وہ بھی ایک دلچسپ قصہ ہے لیکن میں وہ آپ کو سناؤں گا نہیں۔ یہ ضرور کہوں گا کہ اس قسم کی حسین اور تجربہ کار بازاری عورت سے نپٹنے کے لئے بڑی مضبوط شخصیت اور بڑے مضبوط اعصاب کی ضرورت ہے۔ میں ضروری نہیں سمجھتا کہ اُس کے ساتھ میری جتنی بھی باتیں ہوئیں وہ ساری کی ساری ہی لکھوں۔ چند ایک ضروری سوال جواب پیش کر دیتا ہوں۔

"نجمہ!" — میں نے کہا — "مجھے یہ توقع رکھنی ہی نہیں چاہیئے کہ تم سچ بولو گی۔ کوشش کرنا کہ سچ بولو کیونکہ تمہارا فائدہ اور تمہاری نجات اسی میں ہے"۔

"آپ کو مجھ سے سچ کی توقع صرف اس لئے نہیں کہ میں طوائف ہوں" —

نجمہ نے کہا — "میں آپ کو یہ بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ مجھے پوری طرح احساس ہے کہ ایک آدمی قتل ہو گیا ہے اور آپ تفتیش کر رہے ہیں۔ میں جھوٹ بول کر اپنے آپ کو نہیں پھنساؤں گی۔ آپ مجھ سے پوچھیں کیا پوچھتے ہیں۔ پھر تفتیش کر کے معلوم کریں کہ میں نے سچ بولا ہے یا جھوٹ"۔

"چلو دیکھ لیتے ہیں" — میں نے کہا — "یہ بتاؤ کہ تمہیں خالد اچھا لگتا تھا یا ارجمند... وہ جو تمہارا دوسرا عاشق زار ہے"۔

"آپ آجائیں میرے ہاں" — اُس نے بڑی شوخ مسکراہٹ سے جواب دیا — "آپ مجھے ان دونوں سے زیادہ اچھے لگیں گے .... آپ پولیس کے افسر ہیں۔ کیا آپ اتنا بھی نہیں جانتے کہ مجھ جیسی ناچنے گانے والی ہر گاہک کی محبوبہ ہوتی ہے لیکن اُس کا محبوب صرف روپیہ ہے؛ دونوں شہزادے تھے۔ شراب کے نشے میں میری محبت کا دم بھرتے تھے۔ دونوں سے زیادہ سے زیادہ رقم بٹورنے کے لئے انہیں ایک دوسرے سے بڑھ کر محبت کا جھانسہ دیتی تھی۔ عیاشی اور بدی کے بازار میں کوئی عشق و محبت نہیں ہوتا جناب!"

"لیکن تم نے ایک آدمی کو تو مروا دیا ہے نا!" — میں نے کہا۔

"مجھے سات آٹھ روز پہلے پتہ چلا ہے کہ خالد مر گیا ہے" — نجمہ نے کہا — "اس کے ساتھ یہ افواہ بھی سنی کہ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ اسے زہر دیا گیا ہے"۔

"تمہیں کس نے بتایا تھا؟"

"بتانا کس نے تھا!" — نجمہ نے جواب دیا — "وہ میرا بڑا موٹا گاہک تھا، کئی راتیں نہ آیا تو میں نے ارجمند سے پوچھا کہ تمہارا رقیب کہاں ہے۔ اُس نے کہا — 'درویشوں کی رقابت نے اُسے زمین میں اُتار دیا ہے۔ مر گیا ہے سالا' — مجھے بہت افسوس ہوا۔ میں نے پوچھا کہ وہ کیسے مرا ہے؟ اُس نے بتایا کہ سنا ہے کسی نے اُسے زہر دے دیا تھا"۔

"ایک بات بتاؤ نجمہ!" — میں نے پوچھا — "جب اُس نے کہا تھا کہ درویشوں کی رقابت نے اُسے زمین میں اُتار دیا ہے اور پھر اُس نے تمہیں

یہ بتایا کہ اُسے کسی نے زہر دیا ہے تو کیا تمہیں شک نہیں ہُوا کہ زہر ارجمند نے ہی اُسے دیا ہوگا؟"

"نہیں؟ — نجمہ نے جواب دیا — "میں نے سوچا تک نہیں کہ ارجمند نے اُسے زہر دیا ہوگا ... وہ دے بھی کہاں سکتا تھا۔ ان کی آپس میں دشمنی تھی اس لئے ان کی کہیں ملاقات ہو نہیں سکتی تھی۔ میرے ہاں بھی الگ الگ آتے تھے۔"

"نجمہ!" — میں نے اُس کی طرف جُھک کر دھیمی سی آواز میں کہا — "اگر میں یہ کہوں کہ زہر تمہارے ہاتھ سے دلایا گیا ہے تو تم اپنی بیگناہی میں کیا کہو گی؟"

نجمہ نے لمبا سانس لیا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور اس طرح سر ہلایا جیسے میں ایک نادان بچہ ہوں اور کوئی بیوقوفی کی بات کہہ بیٹھا ہوں۔ اُس کا یہ انداز اتنا پختہ اور پُراثر تھا کہ میں نے اس اثر کو اپنے آپ پر محسوس کیا لیکن میں نے اتنی جلدی ہار نہیں ماننی تھی۔

"معلوم ہوتا ہے ہماری دنیا سے اور ہمارے کاروبار سے آپ بالکل ناواقف ہیں" — اُس نے کہا — "میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ ہم اپنے گاہکوں کے دل نہیں ان کی جیبیں دیکھا کرتی ہیں۔ باتیں ہم دل کی ہی کیا کرتی ہیں۔ اسی سے ہمارے گاہک اُلّو بنے رہتے ہیں۔ ارجمند کوئی نواب یا مہاراجہ نہیں کہ میں اُس کی خاطر کسی کو زہر دے دیتی۔"

"وہ آخری بار تمہارے پاس کب آیا تھا؟"

"تقریباً دو مہینے پہلے" — اُس نے ذرا سوچ کر جواب دیا — "وہ جب بھی اتنی لمبی مدت کے لئے غیر حاضر ہوتا تھا تو میں سمجھ جاتی تھی کہ اپنی جاگیر پر گیا ہُوا ہے۔ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ واپس کب آیا تھا۔"

یہاں آکر وہی بات میرے ذہن میں آگئی کہ مقتول جس روز اراضی سے واپس آیا اُسی شام اُسے یہ مہلک تکلیف شروع ہوگئی۔ میں نے نجمہ سے کچھ اور باتیں پوچھیں اور اُسے باہر بھیج کر اُس کے ایک آدمی کو بلایا۔

دوسری رقاصہ

نجمہ کے اس آدمی سے میں نے کہا کہ فلاں دن مقتول اُن کے ہاں آیا تھا۔ اس آدمی نے سوچ سوچ کر جواب دیا کہ مقتول کو اُن کے ہاں آتے تین مہینے گزر چکے ہیں۔ وہ موت کے بعد کا ایک مہینہ بھی اس مدت میں شامل کر رہا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ نجمہ تو یہ کہتی ہے کہ وہ فلاں رات آیا تھا۔

"نہیں حضور!" — اُس نے جواب دیا — "بائی نے ایسا نہیں کہا ہوگا۔ آپ شاید غلط سمجھے ہیں۔ وہ تو ہماری بڑی موٹی آسامی تھی۔ اُسے ہم کیسے بھول سکتے ہیں؟"

اس کے بعد میں نے انیسہ کو بلایا۔ وہ بھی نجمہ جیسی ہی تھی۔ اُس نے بھی ویسی ہی باتیں کیں جیسی نجمہ نے کی تھیں۔ دونوں کا پیشہ ایک تھا اس لئے دونوں کے انداز بھی ایک جیسے تھے۔ انیسہ نے بھی کہا کہ مقتول اُس کا بڑا موٹا گاہک تھا۔

"انیسہ!" — میں نے کہا — "نجمہ کیسی عورت ہے؟ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ اس نے خالد کو زہر دیا ہو؟"

"عالیجاہ!" — انیسہ نے جواب دیا — "نجمہ میری ہم پیشہ ہے۔ ہماری آپس میں کاروباری رقابت چلتی ہے لیکن اس رقابت کو ہم اس حد تک نہیں پہنچنے دیتیں جہاں کسی کو بہت زیادہ نقصان پہنچے۔ میں اپنے پیشے کے اصولوں کی بات کروں تو میں یقین سے کہتی ہوں کہ کوئی رقاصہ ایک گاہک کو خوش کرنے کے لئے کسی دوسرے گاہک کو ناراض نہیں کرے گی۔ یہ تو میں مان ہی نہیں سکتی کہ کسی رقاصہ نے ایک گاہک کو راضی کرنے کے لئے کسی دوسرے گاہک کو زہر دے دیا ہو۔"

"لیکن انیسہ!" — میں نے کہا — "ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ کسی طوائف یا ناچنے گانے والی نے کسی گاہک کو زہر دے دیا یا کسی اور طریقے قتل کروا دیا۔"

یہ بتایا کہ اُسے کسی نے زہر دیا ہے تو کیا تمہیں شک نہیں ہوا کہ زہر ارجمند نے ہی اُسے دیا ہوگا؟"

"نہیں!" ــــ نجمہ نے جواب دیا ــــ "میں نے سوچا تک نہیں کہ ارجمند نے اُسے زہر دیا ہوگا ... وہ ایسے بھی کہاں سکتا تھا۔ ان کی آپس میں دشمنی تھی اس لئے ان کی کہیں ملاقات ہو نہیں سکتی تھی۔ میرے ہاں بھی الگ الگ آتے تھے۔"

"نجمہ!" ــــ میں نے اُس کی طرف جُھک کر دھیمی سی آواز میں کہا ــــ "اگر میں یہ کہوں کہ زہر تمہارے ہاتھ سے دلایا گیا ہے تو تم اپنی بیگناہی میں کیا کہو گی؟"

نجمہ نے لمبا سانس لیا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور اس طرح سر ہلایا جیسے میں ایک نادان بچہ ہوں اور کوئی بیوقوفی کی بات کہہ بیٹھا ہوں۔ اُس کا یہ انداز اتنا پختہ اور پُراثر تھا کہ میں نے اس اثر کو اپنے آپ پر محسوس کیا لیکن میں نے اتنی جلدی ہار نہیں مانی تھی۔

"معلوم ہوتا ہے ہماری دنیا سے اور ہمارے کاروبار سے آپ بالکل ناواقف ہیں" ــــ اُس نے کہا ــــ "میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ ہم اپنے گاہکوں کے دل نہیں ان کی جیبیں دیکھا کرتی ہیں۔ باتیں ہم دل کی ہی کیا کرتی ہیں۔ اسی سے ہمارے گاہک اُلو بنے رہتے ہیں۔ ارجمند کوئی نواب یا مہاراجہ نہیں کہ میں اُس کی خاطر کسی کو زہر دے دیتی۔"

"وہ آخری بار تمہارے پاس کب آیا تھا؟"

"تقریباً دو مہینے پہلے" ــــ اُس نے ذرا سوچ کر جواب دیا ــــ "وہ جب بھی اتنی لمبی مدت کے لئے غیر حاضر ہوتا تھا تو میں سمجھ جاتی تھی کہ اپنی جاگیر پر گیا ہوا ہے۔ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ واپس کب آیا تھا۔"

یہاں آکر وہی بات میرے ذہن میں آگئی کہ مقتول جس روز اراضی سے واپس آیا اُسی شام اُسے یہ مہلک تکلیف شروع ہوگئی۔ میں نے نجمہ سے کچھ اور باتیں پوچھیں اور اُسے باہر بھیج کر اُس کے ایک آدمی کو بلایا۔

دوسری رقاصہ

نجمہ کے اس آدمی سے میں نے کہا کہ فلاں دن مقتول اُن کے ہاں آیا تھا۔ اس آدمی نے سوچ سوچ کر جواب دیا کہ مقتول کو اُن کے ہاں آتے تین مہینے گزر چکے ہیں۔ وہ موت کے بعد کا ایک مہینہ بھی اس مدت میں شامل کر رہا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ نجمہ تو یہ کہتی ہے کہ وہ فلاں رات آیا تھا۔

"نہیں حضور!" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "بائی نے ایسا نہیں کہا ہوگا۔ آپ شاید غلط سمجھے ہیں۔ وہ تو ہماری بڑی موٹی آسامی تھی۔ اُسے ہم کیسے بھول سکتے ہیں؟"

اس کے بعد میں نے انیسہ کو بلایا۔ وہ بھی نجمہ جیسی ہی تھی۔ اُس نے بھی ویسی ہی باتیں کیں جیسی نجمہ نے کی تھیں۔ دونوں کا پیشہ ایک تھا اس لئے دونوں کے انداز بھی ایک جیسے تھے۔ انیسہ نے بھی کہا کہ مقتول اُس کا بڑا موٹا گاہک تھا۔

"انیسہ!" ــــ میں نے کہا ــــ "نجمہ کیسی عورت ہے؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے خالد کو زہر دیا ہو؟"

"عالیجاہ!" ــــ انیسہ نے جواب دیا ــــ "نجمہ میری ہم پیشہ ہے۔ ہماری آپس میں کاروباری رقابت چلتی ہے لیکن اس رقابت کو ہم اس حد تک نہیں پہنچنے دیتیں جہاں کسی کو بہت زیادہ نقصان پہنچے۔ میں اپنے پیشے کے اصولوں کی بات کروں تو میں یقین سے کہتی ہوں کہ کوئی رقاصہ ایک گاہک کو خوش کرنے کے لئے کسی دوسرے گاہک کو ناراض نہیں کرے گی۔ یہ تو میں مان ہی نہیں سکتی کہ کسی رقاصہ نے ایک گاہک کو راضی کرنے کے لئے کسی دوسرے گاہک کو زہر دے دیا ہو۔"

"لیکن انیسہ!" ــــ میں نے کہا ــــ "ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ کسی طوائف یا ناچنے گانے والی نے کسی گاہک کو زہر دے دیا یا کسی اور طریقے سے قتل کروا دیا۔"

”ہاں عالیجاہ!“ ___ انیسہ نے جواب دیا ___ ”آپ نے جتنے واقعات سُنے ہیں اُن پر اگر غور کریں تو قتل کی وجوہات صاف نظر آئیں گی۔ اگر کوئی مہاراجہ یا نواب کسی رقاصہ کو اپنی بیوی یا داشتہ بنانا چاہے اور راستے میں کوئی اور حائل ہو تو نواب یا مہاراجہ بے تحاشہ رقم دے کر رکاوٹ بننے والے آدمی کو مروا سکتا ہے۔۔۔۔ لیکن صاحب! اگر وہ نواب یا مہاراجہ ہے تو کسی کو ایک طوائف کے ہاتھوں کیوں مرواتے گا؟ وہ اپنی محبوبہ کو مصیبت میں نہیں ڈالے گا۔ اس کی بجائے وہ کسی اور طریقے سے اس شخص کو مروائے گا۔“

میں آپ کو ان دونوں بازاری عورتوں کے مکالمے اپنی زبان میں سنا رہا ہوں جو بڑی آسان اور سیدھی سادی اُردو ہے۔ اُن کی زبان نہایت پُرتکلف اور شُستہ تھی۔ وہ بڑے امیر پرستاروں کی بڑی اونچی قسم کی طوائفیں تھیں۔ ہندوستان کے بڑے شہروں خصوصاً دِلّی اور لکھنؤ کی ناچنے گانے والیاں شائستگی اور اُردو کی نفاست میں مشہور تھیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ میں اُن کی زبان سے یا اُن کے انداز سے متاثر ہو گیا۔ انہیں میں نے مشتبہ افراد کی فہرست سے نکال دیا تھا۔ انہیں الزام سے بری قرار دینے کی وجہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ مہلک بیماری کی ابتدا کی شام یا اس سے دو تین روز پہلے مقتول ان دونوں میں سے کسی کے ہاں نہیں گیا تھا۔ صرف اتنا سا شک میرے ذہن میں رہ گیا تھا کہ زہر اگر بہت دن پہلے دیا گیا تھا تو ان دونوں پر شک کیا جا سکتا تھا۔ میں نے یہ شک اُسی وقت رفع کرنے کی کوشش کی۔ دونوں کے متعلق بتایا گیا تھا کہ مقتول انہیں اراضی پر بھی لے جایا کرتا تھا۔ میں نے ان دونوں سے پوچھا کہ اب مقتول اراضی پر گیا تھا تو کیا ان میں سے کوئی وہاں گئی تھی؟ مجھے بتایا گیا کہ دونوں میں سے کوئی بھی نہیں گئی۔ میں نے انہیں کہا تھا کہ سوچ کر جواب دیں کیونکہ میں اراضی پر جا کر معلوم کروں گا پھر بھی انہوں نے کہا کہ وہ نہیں گئیں۔

میں نے انہیں جب رخصت کیا اُس وقت رات گزر چکی تھی۔ اس کے کچھ دیر بعد ارجمند آ گیا۔ اُس نے آتے ہی دیر سے آنے کی معذرت کی اور بتایا کہ وہ کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔

”کسی کام سے نہیں“ ___ میں نے کہا ___ ”تم شراب کے نشے میں ڈوبے ہوتے تھے۔“

اُس نے اردو بولنے والوں کی طرح پھر معذرت کی اور بڑے پُرتکلف الفاظ استعمال کئے، پھر مجھ سے پوچھا کہ میں نے اُسے کیوں بلایا ہے۔

”درویش صاحب!“ ___ میں نے کہا ___ ”میں نے صرف یہ معلوم کرنے کے لئے آپ کو زحمت دی ہے کہ آپ نے اپنے رقیب خالد کو کس طرح زمین میں اُتارا تھا۔“

”حضورِ انور!“ ___ اُس نے شاعروں کے انداز میں کہا ___ ”کیا آپ اس سوال کی وضاحت فرمائیں گے؟“

”ہاں حضور!“ ___ میں نے کہا ___ ”لیکن وضاحت کے لئے آپ کو اُس کمرے میں لے جانا پڑے گا جہاں پتھروں جیسے سخت مجرم بھی اقبالِ جُرم کر لیا کرتے ہیں۔ آپ کوشش کریں کہ میرے سوال کو یہیں سمجھ لیں۔“

اُس نے کوئی جواب دیئے بغیر حیران سا ہو کر مجھے دیکھا جیسے وہ بھی نہ سمجھا ہو۔

”تم خالد کے قاتل ہو!“ ___ میں نے کہا۔

”کیا فرما رہے ہیں آپ حضور؟“ ___ اُس نے کہا اور وہ [illegible] کی طرح کرسی پر اُچھلنا شروع کر دیا۔ اُس کے مُنہ سے اور کوئی بات نکلتی ہی نہیں تھی۔

”تم نے خالد کے مرنے کے بعد یہ الفاظ مجھ سے کہے تھے“ ___ میں نے کہا ___ ”کیا تم نے یہ کہا تھا کہ درویشوں کی رقابت نے اُسے زمین میں اُتار دیا ہے؟“

وہ سوچ میں کھو گیا۔ کبھی ہنسنے لگتا، ذرا فوراً ہی رونی سی صورت بنا لیتا۔

”کچھ یاد نہیں آ رہا حضور!“ ___ اُس نے کہا ___ ”نشے میں شاید کوئی ایسی بات مُنہ سے نکل گئی ہو۔“

"دیکھو میاں ارجمند!" — میں نے کہا — "میں تمہیں سوچنے کا موقع دیتا ہوں۔ اقبال جرم کر لو گے تو فائدے میں رہو گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔"

وہ ہکلا ہکلا کر کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں کمرے سے نکلا اور ایک کانسٹیبل سے کہا کہ اسے پچھلے کمرے میں بٹھا کر باہر سے دروازہ بند کر دے۔ مجھے ابھی خالد کی اراضی پر جانا تھا۔ وہاں سے آکر دیکھنا تھا کہ ارجمند کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے۔ مزید حالات سامنے آنے تک میں اسے شامل تفتیش رکھنا ضروری سمجھتا تھا۔ اسے کانسٹیبل اس طرح پیچھے کمرے میں لے گیا جس طرح بکرا قصائی کے ساتھ ذبح ہونے کے لئے جاتا ہے۔

میں نے اسی وقت خالد کی اراضی پر جانے کی تیاری شروع کر دی۔ جس ریلوے سٹیشن پر ہم نے اترنا تھا، وہ ایک سو بیس یا ایک سو پچیس میل دور تھا۔ وہاں سے لاری یا یکے پر نو دس میل کا سفر تھا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد اپنا سٹاف ساتھ لیا اور میں ریلوے سٹیشن پہنچ گیا۔

بیوہ اور اُس کی جوان بیٹی

رات کے نو بجے کے لگ بھگ ہم منزل پر پہنچ گئے اور میں اُس علاقے کے تھانے میں آگیا۔ اُن دنوں وہاں ایک سکھ سب انسپکٹر تھانہ انچارج تھا۔ رہائش کا انتظام ڈاک بنگلے میں کیا۔ اس سب انسپکٹر کو میں اپنے ساتھ ڈاک بنگلے میں لے گیا۔ اس سے بہت سی باتیں پوچھنی تھیں۔

اُس سے خالد کی اراضی کے متعلق پوچھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ خالد کو جانتا ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ وہ مر گیا ہے اور وہ زہر خورانی سے مرا ہے تو سکھ کچھ زیادہ حیران نہ ہوا۔

"اب میری کچھ مدد کرو جوگندر سنگھ!" — میں نے کہا — "یہاں مقتول کی کسی کے ساتھ دشمنی یا لڑائی جھگڑا یا کوئی اور تنازعہ تھا؟"

"میرے پاس کبھی کوئی رپورٹ نہیں آئی تھی" — اُس نے جواب دیا — "او ملک بھائی! ان لوگوں کے ہاں یہی کچھ ہوتا رہتا ہے۔ یہاں جب اپنی زمینوں پر آتے ہیں تو یہاں بادشاہ بن کر رہتے ہیں۔ میں خالد کو جانتا تھا۔ وہ

بھی ایسا ہی بادشاہ تھا۔ یہاں آکر بھی رنڈیوں کے مجرے کرواتا تھا۔ اپنے جیسے لوفر لفنگے شہزادوں کو یہاں ساتھ لاتا تھا۔ ڈیڑھ دو مہینے گزار کر چلا جاتا تھا۔"

میں نے اس سکھ سے کچھ اور باتیں بھی معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن ایسے پتہ چلتا تھا جیسے اسے اپنے علاقے کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں یا خالد کے ساتھ اسے پوری واقفیت نہیں۔ مختصر یہ کہ اُس سے مجھے کوئی خاص بات معلوم نہ ہوئی۔ رات ڈاک بنگلے میں گزری۔ علی الصبح خالد کی اراضی پر جانے کے لئے تیار ہوئے تو میرے کہنے پر سب انسپکٹر جوگندر سنگھ نے اپنے تھانے کا ایک ہیڈ کانسٹیبل میرے ساتھ کر دیا۔ اُس نے شاید مجھے خوش کرنے کے لئے جو ہیڈ کانسٹیبل مجھے راہنمائی اور مدد کے لئے دیا تھا وہ مسلمان تھا۔ وہ کہنے لگا کہ پیدل ہی چلتے ہیں۔ جب ہم چلے تو تھانے سے کچھ دور جا کر ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے میرے سٹاف سے الگ کر لیا۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گیا کہ وہ مجھے کچھ بتانا چاہتا ہے۔

"سب انسپکٹر صاحب نے آپ کو کچھ بتایا ہے؟" — ہیڈ کانسٹیبل نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا تمہیں معلوم ہے میں کیوں آیا ہوں؟"

"ہاں ملک صاحب!" — ہیڈ کانسٹیبل نے جواب دیا — "آپ مجھے نہیں جانتے۔ میں آپ کو جانتا ہوں۔ مجھے میرے سب انسپکٹر صاحب نے بتایا ہے کہ خالد پرویز زہر خورانی سے مارا گیا ہے اور آپ سی۔ آئی۔ اے کی طرف سے تفتیش کرنے آئے ہیں۔ میں نے آپ سے پوچھا ہے کہ ہمارے سب انسپکٹر صاحب نے آپ کو کچھ بتایا ہے؟"

"نہ بھائی!" — میں نے جواب دیا — "وہ تو پتہ چلتا ہے کہ اپنے علاقے سے واقف بھی نہیں۔"

"اصل شیطان ہے ملک صاحب!" — ہیڈ کانسٹیبل نے کہا — "آپ کو اندھا کرنا چاہتا ہے۔ آپ میرے مسلمان بھائی ہیں اس لئے اپنا فرض سمجھتا

ہوں کہ آپ کو راز کی کچھ باتیں بتا دوں ... خالد کی سب انسپکٹر جوگندر کے ساتھ بڑی گہری دوستی تھی۔ خالد جب یہاں آتا تھا تو سب انسپکٹر کئی راتیں خالد کے گھر میں گزارتا تھا۔ پچھلے دنوں یہاں ایک لڑکا جس کی عمر تیرہ چودہ سال تھی، لاپتہ ہو گیا تھا۔ وہ ایک بیوہ کا بیٹا ہے۔ مسلمان ہیں۔ اس بیوہ کی ایک جوان بیٹی ہے لیکن ملک صاحب! کیا خوبصورتی ہے اس لڑکی کی! لڑکا لاپتہ ہوا تو ماں اور اُس کی یہ بیٹی تھانے میں آئیں اور سب انسپکٹر جوگندر سنگھ کو رو رو کر بتایا کہ کل شام سے ان کا لڑکا لاپتہ ہے ....

"جوگندر نے ویسے ہی ایک کاغذ پر لڑکے کا حُلیہ وغیرہ لکھ لیا اور ان عورتوں کو تسلی دی کہ لڑکا مل جائے گا۔ اس کے بعد اس شخص نے کوئی کارروائی نہیں کی۔ اتفاق سے میں اُس کے پاس کھڑا تھا جب ماں بیٹی رپورٹ دینے آئی تھیں اور چلی گئی تھیں۔ سب انسپکٹر نے مجھے کہا کہ ان زمینداروں اور جاگیرداروں کی اولاد آوارہ ہوتی ہے۔ لڑکا بغیر بتائے شہر چلا گیا ہو گا اور گھوم پھر کر واپس آجائے گا ....

"اس کے بعد خالد تھانے آیا۔ اُس کے ساتھ گمشدہ لڑکے کی بہن تھی۔ دونوں سب انسپکٹر جوگندر کے پاس بیٹھے رہے اور چلے گئے۔ اُسی شام خالد پھر تھانے آیا۔ انہی دنوں علاقے میں ڈکیتی کی دو وارداتیں اور پھر ایک واردات نقب زنی کی ہو گئی۔ جوگندر سنگھ تفتیش میں بہت مصروف ہو گیا۔ خالد ہر روز تھانے آنے لگا۔ جوگندر سنگھ جب مصروف نہیں ہوتا تھا تو خالد کے پاس چلا جایا کرتا تھا۔ جوگندر مصروف ہو گیا تو خالد آنے لگا۔"

"دوستی کی وجہ سے آتا ہو گا" ـــــ میں نے کہا۔

"نہیں ملک صاحب!" ـــــ ہیڈ کانسٹیبل نے کہا ـــــ "میں نے ان دونوں کو سر جوڑے ہوئے دیکھا ہے۔ بات کچھ اور تھی .... ملک صاحب! اس تھانے میں ہم صرف دو مسلمان ہیں۔ ایک میں ہوں اور ایک کانسٹیبل ہے۔ ہم تو ڈر ڈر کر سروس کر رہے ہیں۔ اونچی بات بھی نہیں کرتے۔ آپ جانتے ہیں یہ ہندو اور سکھ مسلمانوں کو کہاں ٹکنے دیتے ہیں اس لئے میں نے دخل اندازی

نہ کی لیکن میں نے اپنے طور پر ٹوہ ضرور لگائے رکھی۔ کچھ دنوں بعد اطلاع آئی کہ لڑکا واپس آگیا ہے۔ جوگندر سنگھ نے کہا کہ میں نے کہا نہیں تھا کہ لڑکا خود کہیں چلا گیا ہے ....

"ملک صاحب! مجھے صحیح واردات کا پتہ نہیں چلا لیکن میں آپ کو ایک آدمی سے ملواؤں گا جو آپ کو بتائے گا کہ اس لڑکے کی گمشدگی کے پیچھے کوئی خاص بات تھی۔ یہ معلوم کرنا آپ کا کام ہے۔"

"مجھے یہ بتاؤ" ـــــ میں نے کہا ـــــ "کہ اس کا خالد کے قتل کے ساتھ کیا تعلق ہے؟"

"یہ میں نے آپ کو اس لئے سنایا ہے کہ آپ کو پتہ چلے کہ سب انسپکٹر جوگندر سنگھ اور خالد کی کتنی گہری دوستی تھی" ـــــ ہیڈ کانسٹیبل نے کہا ـــــ "لڑکے کی گمشدگی کا خالد کے قتل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو سکتا لیکن لڑکے کی بڑی بہن کا خالد کے ساتھ کوئی تعلق ضرور ہے۔ خالد کبھی ان کے گھر پہنچا ہوا ہوتا تھا اور کبھی یہ لڑکی خالد کے ہاں آئی ہوتی تھی ....

"وہاں کوئی نہ کوئی اور واقعہ ہوا ہے لیکن اپنے جاگیردار سے ڈرتے مزارعے کچھ بتاتے نہیں۔ سُنا تھا کہ شہر سے گم ہونے والے لڑکے کے رشتہ دار آتے تھے اور ان کی خالد کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوتی تھی۔ لڑکے کی گمشدگی کو چھوڑیں۔ میرا خیال ہے کہ لڑکے کی بڑی بہن کے متعلق کوئی گڑبڑ ہوتی تھی۔"

"اور کیا گڑبڑ ہوئی ہے" ـــــ میں نے کہا ـــــ "خالد اور اس لڑکی کے آپس میں تعلقات ہوں گے اور لڑکی کے بھائیوں وغیرہ کو پتہ چل گیا ہو گا اور انہوں نے آکر لڑکی اور خالد کے ساتھ کوئی ہنگامہ کیا ہو گا۔"

"یہ آپ خود سوچ لیں ملک صاحب!" ـــــ مسلمان ہیڈ کانسٹیبل نے کہا ـــــ "میں یہ جانتا ہوں کہ خالد کی اراضی پر کوئی نہ کوئی غیر معمولی واقعہ ضرور ہُوا ہے اور اس کا تعلق اس مسلمان بیوہ کی بیٹی کے ساتھ ہے۔"

ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے جس آدمی کا نام بتایا وہ مزارعوں کا نمبردار یا انچارج تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل دراصل مجھے یہ بتا رہا تھا کہ میں سب انسپکٹر جوگندر سنگھ

کی کسی بات پر اعتبار نہ کروں اور وہ بدنیتی سے میرے سامنے بھولا بنا رہا ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے دو چار بڑے اچھے اشارے دیئے۔ انہی باتوں میں ہم خالد کے مکان میں پہنچ گئے۔ پروین نے جس طرح بتایا تھا کہ اُسے یہ ماحول بہت پسند آیا تھا میں نے اُسے ویسا ہی پایا۔ خالد کا یہ مکان چھوٹا سا محل تھا جس کے چاروں طرف پھولدار پودے، سایہ دار درخت اور سبزہ ہی سبزہ تھا۔ اب یہ مکان خالی پڑا تھا۔

اسی علاقے میں خالد کی زمینوں کے ساتھ ہی ایک گاؤں تھا۔ وہاں کا نمبردار یا مکھیا ایک ہندو تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے اس کے متعلق بتایا کہ بڑا گہرا اور ہوشیار آدمی ہے۔ میں نے جاتے ہی اُسے بلایا اور مزارعوں کے نمبردار کو بھی بلا لیا۔ یہ نمبرداری کوئی عہدہ نہیں تھا۔ یہ آدمی چونکہ بدمعاش تھا اور خالد کے خاص ملازموں میں سے تھا اس لئے اُسے مزارعوں وغیرہ کا نمبردار بنا دیا گیا تھا۔ اس کا نام کچھ اور تھا۔ اُسے شاما کہتے تھے۔

حسین اور پُراسرار لڑکی

میں نے پہلے اس بیوہ اور اُس کی بیٹی سے ملنا بہتر سمجھا جن کے متعلق ہیڈ کانسٹیبل نے بتایا تھا کہ شہر سے ان کے رشتہ دار آتے تھے اور مقتول کے ساتھ ان کی کوئی گڑبڑ ہوتی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ اپنی اراضی میں اپنے بنائے ہوئے مکان میں رہتی ہے۔ یہ مکان خالد کے مکان سے کم و بیش ایک میل دُور تھا۔ باتیں کچھ ایسی بتائی گئی تھیں کہ ان سے ملنا ضروری تھا۔

میں ان کے گھر گیا۔ اُن کے ایک نوکر نے اندر جا کر ہمارے آنے کی اطلاع دی۔ بیوہ باہر آئی۔ میں وردی میں نہیں تھا۔ میں نے پرائیویٹ کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ میں اپنے سٹاف میں سے صرف ایک ہیڈ کانسٹیبل کو ساتھ لے گیا تھا۔ وہ بھی پرائیویٹ کپڑوں میں تھا۔ سی۔ آئی۔ اے کا سٹاف وردی نہیں پہنا کرتا تھا لیکن وہاں کے تھانے کا ہیڈ کانسٹیبل وردی میں تھا۔ اُسے دیکھ کر بیوہ اتنی گھبرائی کہ اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ میں نے جب اپنا تعارف

کرایا تو اُس کی حالت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ وہ معزز عورت لگتی تھی۔

میں اُسے کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ ایک بڑی خوبصورت لڑکی اندر سے آ گئی۔ وہ بھی ہمیں دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ یہ بیوہ کی بیٹی نوروز تھی۔ اُس نے پوچھا کہ ہم کیوں آئے ہیں؟

"آپ دونوں اتنی گھبرا کیوں گئی ہیں؟" — میں نے ہنستے ہوئے کہا — "میں کسی کو گرفتار کرنے تو نہیں آیا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں تھوڑی دیر کے لئے اندر آ جاؤں۔ میں زیادہ دیر نہیں رُکوں گا۔ گھر میں کوئی مرد ہے؟"

مجھے ابھی جواب نہیں ملا تھا کہ گھر کا مرد باہر سے دوڑتا آیا۔ وہ تیرہ چودہ سال عمر کا لڑکا تھا۔ وہ اس بیوہ کا بیٹا تھا۔ اپنی بہن کی طرح خوبصورت تھا۔ ماں نے آگے بڑھ کر بیٹے کو اس طرح بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ لگا لیا جیسے اُس کے بیٹے کو میری طرف سے خطرہ ہو۔ میں نے ایک بار پھر انہیں اندر آنے کے لئے کہا تو وہ مجھے ایک کمرے میں لے گئیں اور بٹھایا۔ میں اپنے دونوں ہیڈ کانسٹیبلوں کو باہر چھوڑ آیا تھا۔

"آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ خالد مر گیا ہے!" — میں نے کہا۔

"اُن کے مزارعوں سے سُنا ہے" — لڑکی نے جواب دیا۔

"یہ بھی سُنا ہو گا کہ وہ کیسے مرا ہے!"

"کہتے تھے اُسے زہر دیا گیا ہے" — لڑکی نے کہا — "انسپکٹر صاحب ہمارا خالد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ آپ ہمارے پاس کیوں آئے ہیں؟"

میں نے خاص طور پر دیکھا کہ لڑکی کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ رو پڑے گی۔ میں نے ماں بیٹی کو ایک بار پھر تسلی دی کہ وہ گھبرائیں اور ڈریں نہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ صرف لڑکی بولتی تھی۔ ہر سوال کا وہی جواب دیتی تھی اور ماں خاموش بیٹھی تھی۔ چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ بہت ڈری ہوئی ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ ذرا اندر چلی جائے۔ میں صرف لڑکی سے بات کرنا بہتر سمجھتا تھا۔ ماں اپنی بیٹی [illegible] انہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اُسے اٹھایا۔

"روزی میری ایک ہی بیٹی ہے"— ماں نے جاتے ہوتے دروازے میں رُک کر کہا — "یتیم ہے۔ ذرا خیال رکھنا"

"اپنی بہنوں جیسا خیال رکھوں گا محترمہ!"— میں نے کہا — "آپ تھوڑی سی دیر صبر کریں"

روزی جس کا نام نوروز تھا، میرے پاس اکیلی رہ گئی۔ میں نے اُس سے اُس کے خاندان کے متعلق پوچھا۔ وہ خالد کے ہی شہر کی رہنے والی تھیں۔ نو دس سال پہلے اس لڑکی کا باپ مر گیا تھا۔ ایک بڑا بھائی تھا۔ وہ بھی چار پانچ سال پہلے مر گیا تھا۔ یہاں ان کی بہت سی زمین تھی۔ ماں بیٹی سال میں تین چار مہینے یہاں گزارتی اور مزارعوں کی نگرانی کرتی تھیں۔ نوروز کا بھائی سکولوں میں چھٹیوں کی وجہ سے ان کے ساتھ تھا۔

نوروز جب بولنے لگی تو میں نے محسوس کیا کہ ذہین لڑکی ہے۔ اس نے میٹرک پاس کی تھی جو اُس زمانے میں بہت زیادہ تعلیم سمجھی جاتی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ خالد کے ساتھ ان لوگوں کا کیسا تعلق تھا۔

"کوئی خاص تعلق نہیں تھا"— نوروز نے کہا — "چونکہ اُس کی زمین ہمارے ساتھ ہے اس لئے کبھی کبھی سلام دعا ہو جاتی تھی"

"روزی!"— میں نے کہا — "مجھ سے کچھ چھپاؤ نہیں۔ تمہارا بھائی لاپتہ ہو گیا تھا تو خالد اس کے لئے بھاگ دوڑ کرتا رہا تھا۔ تم خالد کے ہاں جاتی رہی ہو اور خالد تمہارے ہاں آتا رہا ہے۔ تم مجھے صحیح بات کیوں نہیں بتاتیں؟"

"یہ اُنہی دنوں کی بات ہے جب میرا بھائی لاپتہ ہو گیا تھا"— اُس نے کہا — "یہ میرا ایک ہی بھائی ہے۔ میں اور امی تو پاگل ہوتی جا رہی تھیں۔ خالد صاحب نے ہماری بہت مدد کی تھی"

"لڑکا کہاں سے ملا تھا؟"

"بغیر بتائے سیر سپاٹے کے لئے نکل گیا تھا"— نوروز نے کہا اور اُس نے بتایا کہ وہ کون کون سے شہر کی سیر کر کے آ گیا تھا۔

اس لڑکے کے چلے جانے اور واپس آجانے کے ساتھ میری دلچسپی نہیں تھی۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس لڑکی کا خالد کے ساتھ کوئی

تعلق تھا یا نہیں۔

"تمہارے رشتہ دار یہاں آتے تھے"— میں نے پوچھا — "کیوں آتے تھے؟"

"ہم نے انہیں اپنے لڑکے کے لاپتہ ہو جانے کی اطلاع دی تھی"— روزی نے جواب دیا — "اور وہ آ گئے"

"خالد کے ساتھ اُن کی کیا گڑبڑ ہوئی تھی؟"

"خالد کے ساتھ؟"— اُس نے حیران ہو کر کہا — "خالد کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں تھا"

"تمہاری شادی ابھی نہیں ہوئی؟"

"منگنی ہو چکی ہے"— اُس نے جواب دیا — "میرا منگیتر بھی آیا تھا"

میں نے بہت کوشش کی کہ اُس سے کہلوا سکوں کہ خالد کے ساتھ اُس کے تعلقات تھے یا خالد نے اُسے پھانسنے کی کوشش کی تھی اور روزی کے رشتہ دار اسی سلسلے میں آتے تھے لیکن میں اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔

"خالد بدنام آدمی تھا"— روزی نے کہا — "میں اُس کے ساتھ اچھا یا بُرا تعلق رکھ ہی نہیں سکتی تھی"

میں وہاں سے آ گیا۔ اس لڑکی کو خاص طور پر اور اُس کی ماں کو میں نے ذہن سے اُتارا نہیں بلکہ ذہن پر پہلے سے زیادہ سوار کر لیا۔ پولیس کو دیکھ کر ہر کوئی گھبراتا ہی ہے لیکن اس بیوہ اور اُس کی بیٹی نوروز کی گھبراہٹ کچھ اور قسم کی تھی۔ نوروز جسے ماں روزی کہتی تھی، مجھے ایسے لگی جیسے وہ کچھ چھپا رہی تھی۔ اُس کی اُدھوری اُدھوری باتیں مجھے شک میں ڈال رہی تھیں۔ اگر میں کہوں کہ لڑکی پُراسرار تھی تو شاید غلط نہیں ہو گا۔

ان شکوک کے علاوہ میں نے یہ بھی سوچا کہ مقتول عورتوں کا پرستار بتایا گیا تھا جسے عورتوں کا شکاری کہا جاتا ہے۔ یہاں اُس کے پڑوس میں اُسی کی کلاس کی اتنی خوبصورت لڑکی تھی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ خالد اس لڑکی

کی طرف توجہ نہ دیتا۔ اُسے اس لڑکی کو پھانسنے کے لئے بڑا اچھا بہانہ مل گیا تھا۔ اس لڑکی کا بھائی لاپتہ ہو گیا تھا اور خالد لڑکی کو ساتھ لئے پھر تا رہا تھا۔

کس نے اغوا کیا تھا؟

میں نے وہاں سے واپس آتے ہوئے اپنے ہیڈ کانسٹیبل اور تھانے کے ہیڈ کانسٹیبل کو بتایا کہ لڑکی نے کیا کہا ہے۔

"غلط کہتی ہے" — ہیڈ کانسٹیبل اشفاق (تھانے کے ہیڈ کانسٹیبل) نے کہا — "ملک صاحب! اس کا تعلق خالد کے ساتھ اچھا بھلا رہا ہے۔ آپ پہلے وہاں، میں آپ کو اصل بات معلوم کرا دوں گا۔ آپ پہلے ہی اِدھر آ گئے۔ پہلے اُن سے پوچھتے۔ رام سہاتے (گاؤں کے نمبردار) اور شامے سے۔ شاید یہ دونوں بھی پردہ ڈالنے کی کوشش کریں۔ خالد ان کو بہت انعام دیا کرتا تھا۔"

نوروزا اور اُس کی ماں کے پاس میں پہلے ہی اس لئے چلا گیا تھا کہ ذرا انہیں دیکھ لوں اور سونگھ لوں کہ یہ کیا چیز ہیں۔ سچ بولتی ہیں یا مجھے ٹرخاتی ہیں۔ میرا اپنا ایک طریقہ تفتیش تھا۔ میں اس کے مطابق چل رہا تھا۔ میں جو شک لے کر گیا تھا، وہ پختہ ہو گیا تھا۔

خالد کے مکان میں آ کر میں نے رام سہاتے کو الگ بٹھایا اور مقتول کے متعلق پوچھا۔ اُس نے وہی کچھ بتایا جو میں پہلے سن چکا تھا۔ مثلاً خالد عیاش تھا اور یہاں آ کر زیادہ عیاشی کرتا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ خالد نے اُس کے گاؤں کی کسی لڑکی کے ساتھ تعلقات قائم کر لئے ہوں گے اور لڑکی کے گھر کے کسی آدمی نے دھوکے میں مقتول کو زہر پلا دیا ہو گا۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ مقتول کی طبیعت اُس شام خراب ہوتی تھی جس شام وہ اراضی سے واپس اپنے شہر پہنچا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے زہر اراضی پر دیا گیا تھا۔

"نہیں" — رام سہاتے نے جواب دیا — "وہ ہمارے گاؤں میں کبھی نہیں آیا تھا اور گاؤں کی کوئی عورت اِدھر کبھی نہیں آتی .... حضور! خالد شہزادہ تھا۔ میرے ساتھ اُس کا اچھا تعلق تھا۔ وہ بڑے قیمتی ہیرے کو

ہاتھ ڈالتا تھا۔ میرے ساتھ اُس کی دوستی اس لئے تھی کہ کبھی کوئی زمینوں کا کام ہوتا تھا تو وہ مجھ سے مزدور وغیرہ لیا کرتا تھا۔"

وہ کوئی خاص بات نہیں بتا رہا تھا۔ میں نے جب پولیس انسپکٹروں کی طرح بات کی اور اُسے اپنا آپ دکھایا تو اُس نے باقی باتیں بتائیں۔

"آپ جس عورت سے ملنے گئے تھے اُس کی بیٹی آپ نے دیکھی ہو گی" — رام سہاتے نے کہا — "یہ امیر کبیر زمیندار اور جاگیردار لوگ ہیں۔ میں اندر کی بات نہیں بتا سکتا۔ میں یہ بات یقین سے کہتا ہوں کہ اس لڑکی کے ساتھ خالد کا تعلق تھا اور میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ اس لڑکی کا بھائی لاپتہ ہو گیا تھا، یہ بھی کوئی ناٹک تھا۔ اس بارے میں شاما جانتا ہو گا اور ضرور جانتا ہو گا۔"

رام سہاتے نے کچھ اور باتیں بتائیں جو میرے کام آ سکتی تھیں۔ میں نے رام سہاتے کو اٹھا کر شامے کو بلایا اور اُسے کہا کہ اُس کا آقا مارا گیا ہے اور اب وہ جھوٹ نہ بولے۔ یہاں اس مکان میں جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ مجھے سنا دے۔

"شامے!" — میں نے کہا — "تم دیکھ رہے ہو میں تفتیش کر رہا ہوں۔ اگر تم نے کوئی بات چھپائی اور وہ مجھے بعد میں معلوم ہوئی تو تم شہادت چھپانے کے جرم میں گرفتار کر لئے جاؤ گے۔"

وہ بے چارہ مزارع تھا۔ کچھ چھپانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے خالد کی عیاشیوں کی وہی تفصیل سنائی جو مجھے پہلے ہی معلوم تھی۔ نئی بات اُس نے یہ بتائی کہ نوروز کے ساتھ خالد کا قریبی تعلق تھا اور نوروز کا بھائی اپنے آپ کہیں نہیں گیا تھا بلکہ وہ اغوا ہوا تھا اور کچھ دنوں بعد اُسے چھوڑ دیا گیا تھا۔

"کس نے اغوا کیا تھا؟"

"حضور!" — اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا — "میں نے جو سنا ہے وہ آپ کو بتا دیا ہے۔ میں آپ کو دو مزارعوں کے نام بتا دیتا ہوں۔ ساری حقیقت وہی آپ کو سنائیں گے۔"

"تم کیوں نہیں سناؤ گے؟" — میں نے کہا — "تم مزارعوں پر افسر

گئے ہوتے ہو۔ میرا خیال ہے تم بُرا نہیں بننا چاہتے۔"

"یہ بات نہیں حضور!" — اُس نے کہا — "میں نے عرض کی ہے کہ میں نے جو سُنا ہے وہ آپ کو بتا دیا ہے۔ مجھے ہر بات کا علم ہوتا ہے لیکن یہاں کوئی ایسا واقعہ ہُوا ہے جو مجھ سے خفیہ رکھا گیا ہے۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ اس کا تعلق لڑکے کے اغوا کے ساتھ ہے اور اس کا تعلق خالد میاں اور اُس لڑکی کے ساتھ ہے جو بیوہ کی بیٹی ہے، اور حضور یہ جو دو مزارعے میں آپ کو بتا رہا ہوں، ان کا تو اس واقعہ کے ساتھ خاص تعلق ہے۔"

"تم نے اِن سے پوچھا نہیں تھا؟" — میں نے کہا — "تم تو ان سے رعب سے پوچھ سکتے تھے۔"

"پوچھا تھا حضور!" — شامے نے کہا — "رعب بھی دیا تھا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر مجھے ٹال دیا کہ مالک کا حکم ہے کہ زبان بند رکھو۔ آپ سراج اور مولوی سے پوچھیں۔ مولوی کا نام شفیع ہے۔ داڑھی کی وجہ سے اُس کا نام مولوی پڑ گیا ہے۔ یہ دونوں بڑے تیز آدمی ہیں۔"

میں نے آپ کو پہلے بتایا ہے کہ میں جس کسی سے پوچھ گچھ کرتا تھا اُس کے ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹے اور بعض کے ساتھ اس سے زیادہ وقت لگ جاتا تھا۔ بے شمار باتیں ہوتی تھیں۔ اگر میں اپنا ہر ایک سوال اور ہر سوال کا جواب لکھنے لگوں تو میری ہر کہانی کی ایک ایک ہزار صفحے کی کتاب بن جاتے۔ میں آپ کو بڑے ہی مختصر سے مکالمے اور موٹے موٹے واقعات اور اہم شہادت سنا رہا ہوں۔ مثلاً شامے کے ساتھ جو باتیں ہوئیں ان سے میں قائل ہو گیا کہ سراج اور مولوی کو تفتیش میں شامل کرنا ضروری ہے۔

میں نے ان دونوں کو بلایا اور دونوں کو اکٹھے کھڑا کر کے کہا کہ میں ان سے الگ الگ تفتیش کروں گا۔ اگر ان کے بیانات میں فرق ہُوا تو دونوں کو گرفتار کر لوں گا۔ میں نے انہیں بھی کہا کہ ان کا وہ آقا مر گیا ہے جس کا انہیں ڈر تھا۔ اب وہ کوئی راز چھپانے کی کوشش نہ کریں۔

"نہ حضور!" — مولوی نے کہا — "ہم ہر بات سچ بتائیں گے۔"

"ہاں حضور!" — سراج نے کہا — "گناہ دوسرے کریں اور سزا ہم کیوں بھگتیں۔" — اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا — "صرف یہ خیال رکھنا حضور! ہم حکم کے غلام ہیں۔ جن کا دیا کھاتے ہیں وہ اپنے گناہ بھی ہمارے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ ہماری مجبوری کا خیال رکھنا مائی باپ!"

میں ان جیسے لوگوں کی مجبوری کا بہت خیال رکھا کرتا تھا۔ میں آپ کو اپنی پہلی کہانیوں میں سُنا چکا ہوں کہ ان مزارعوں اور ان جیسے نوکروں چاکروں کے آقا اپنے گناہ ان کے کھاتے میں کس طرح ڈالا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ اب بھی چل رہا ہے۔

میں مولوی کو الگ لے گیا اور اُسے بٹھا لیا۔

ایک اور واردات

مولوی نے پھر میری منت کی کہ میں مقتول کے باپ وغیرہ کو پتہ نہ چلنے دوں کہ اُس نے مجھے کچھ بتایا ہے۔ میں نے اسے تسلی دی، گھبراہٹ دُور کی، کچھ ہنسی مذاق کی باتیں کر کے اسے اپنے ساتھ کھولا پھر اُس نے مجھے ایسی واردات سنائی کہ میرا دماغ روشن ہو گیا۔ میں اُس کا سارا بیان نہیں سنا رہا۔ چیدہ چیدہ حصے سن لیں۔

اُس نے بھی خالد کی عیاشیوں کی تفصیل سنائی جو وہ یہاں آ کر کیا کرتا تھا۔ پھر اُس نے بتایا کہ اب خالد اپنی اراضی پر آیا تو نوروز اپنی ماں اور چھوٹے بھائی کے ساتھ اپنی اراضی پر آئی ہوئی تھی۔ چند دنوں بعد خالد نے اُن کے ہاں جانا شروع کر دیا پھر نوروز بھی اِدھر آنے لگی۔ کبھی وہ اپنی ماں کے ساتھ آتی اور کبھی اکیلی آ جاتی تھی۔

خالد نے شامے، سراج اور مولوی کو یہ ڈیوٹی دی کہ وہ نوروز کے مزارعوں پر نظر رکھا کریں کہ وہ ماں بیٹی کو پریشان نہ کریں اور دیانتداری سے کام کیا کریں۔ خالد نے انہیں یہ حکم بھی دیا کہ وہ ماں بیٹی کی ضروریات کا بھی خیال

رکھا کریں۔

یہ سلسلہ تقریباً ایک مہینہ چلا۔ ایک روز خالد نے سراج اور مولوی کو بلا کر کہا کہ نوروز کے بھائی کو اغوا کر کے وہ اپنے گھر میں رکھیں اور جتنے دن وہ ان کی قید میں رہے، اُسے کوئی تکلیف نہ ہونے دیں۔ یہ انہیں خالد نے بتانا تھا کہ لڑکے کو کب اور کس طرح رہا کرنا ہے۔ انہیں خالد نے بڑی سختی سے حکم دیا تھا کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔

"شاہ مالکوں کا خاص آدمی ہے" ـــــ مولوی نے کہا ـــــ "لیکن خالد میاں نے کہا تھا کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔"

ان دونوں نے لڑکے کو اس طرح اغوا کیا کہ مولوی اُن کی زمینوں کی طرف گیا۔ لڑکا اکثر گھومتا پھرتا رہتا تھا۔ وہ سراج اور مولوی سے مانوس تھا۔ دونوں اُس کے گھر کام کاج کے لئے آتے جاتے رہتے تھے۔ لڑکا مولوی کو مل گیا۔ لڑکے کے ہاتھ میں غلیل تھی۔ مولوی نے اُسے ایک طرف اشارہ کر کے کہا کہ وہاں بہت سے جنگلی کبوتر اور فاختائیں ہیں۔ انہیں جا کر مارو۔

لڑکا اُدھر چلا گیا۔ مولوی کسی اور طرف نکل گیا۔ فصل اتنے اونچے تھے کہ انہیں کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ مولوی نے لڑکے کو اُس طرف بھیج دیا جہاں جگہ ذرا گہری تھی اور وہاں جھاڑیاں وغیرہ اتنی گھنی اور اونچی تھیں کہ گھوڑا غائب ہو جاتا تھا۔ سراج وہاں انتظار میں بلکہ گھات میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں ایک روز پہلے بھی لڑکے کے اغوا کے لئے گئے تھے لیکن لڑکا انہیں ملا نہیں تھا۔ وہ لڑکے کو گھر سے اُٹھا نہیں سکتے تھے بلکہ گھر سے اُٹھانا ہی نہیں تھا۔ ڈرامہ یہ بنانا تھا کہ لڑکا لاپتہ ہو گیا ہے۔

تیرہ چودہ سال عمر کا یہ لڑکا جنگلی کبوتروں اور فاختاؤں کے شوق میں سراج کی گھات میں جا پہنچا۔ سراج اٹھا اور ایک کھیس لڑکے پر ڈال کر اُسے دبوچ لیا۔ اتنے میں مولوی بھی آ گیا۔ وہ لڑکے کو ادھر بھیج کر دوسری طرف سے ادھر آیا تھا۔ ان دونوں کو امید نہیں تھی کہ اُن کا یہ کام اتنی آسانی سے ہو جائے گا۔ میرے پوچھنے پر مولوی نے بتایا کہ اُنہوں نے لڑکے کو سونگھایا کچھ بھی

نہیں تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایک بوری لے گئے تھے جو بڑے سائز کی تھی۔ انہوں نے لڑکے کے مُنہ پر کپڑا باندھا اور اسے مولوی کے گھر میں پہنچا دیا۔

میں اغوا کی اس واردات کو اتنا آسان نہیں سمجھتا تھا۔ میں حیران تھا کہ انہیں کسی نے دیکھا نہیں۔ میں نے بعد میں وہ جگہ دیکھی جہاں لڑکے کو پکڑا گیا تھا اور وہ راستہ دیکھا جدھر سے لڑکے کو بوری میں ڈال کر مولوی کے گھر پہنچایا گیا تھا۔ انہیں اونچے فصلوں وغیرہ کی سہولت تو حاصل تھی لیکن ان دونوں کی اُستادی کا بھی کمال تھا کہ وہ لڑکے کو کسی کو پتہ چلے بغیر ٹھکانے تک لے گئے۔

بیان دیتے دیتے مولوی رک گیا اور ہاتھ جوڑ کر منت کرنے لگا کہ اُس نے یہ جُرم اپنے آقا کے حکم پر کیا تھا اس لئے میں اسے گرفتار نہ کروں۔

میں نے جو کچھ کرنا تھا وہ تو بعد کی بات تھی لیکن مولوی کو پوری تسلی دی کہ اُسے اپنی حفاظت میں رکھوں گا اور گرفتار نہیں کروں گا۔

دماغ مقتول کا بھی استاد مجرموں جیسا تھا۔ اُس کی ہدایت کے مطابق لڑکے کو مولوی کے گھر رکھا گیا اور اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ کچھ دیر بعد سورج غروب ہو گیا اور جب اندھیرا گہرا ہُوا تو لڑکے کو انہوں نے اٹھایا اور باہر لے گئے۔ باہر ایک گھوڑی تیار تھی۔ انہوں نے لڑکے کو گھوڑی پر ڈالا اور چل پڑے۔ کم و بیش دو گھنٹے گھوڑی کو اپنی اراضی کے رقبے میں ہی گھماتے پھراتے رہے۔ پھر مولوی کے گھر لے آئے اور ایک کمرے میں اُس کی پٹی کھول دی۔ پٹی کھولنے سے پہلے مولوی نے اپنا صافہ نقاب کی طرح اپنے سر اور چہرے پر لپیٹ لیا تاکہ لڑکا اسے شناخت نہ کر سکے۔

اس کے بعد لڑکے کو پانچ چھ دن وہیں رکھا گیا۔ اُسے جو کھانا دیا جاتا تھا وہ خالد کا باورچی پکاتا تھا۔ یہ امیرانہ اور مرغن کھانا ہوتا تھا۔ لڑکے کے آگے کھانا مولوی رکھتا تھا۔ مولوی کا چہرہ صافے میں چھپا ہُوا ہوتا تھا۔ لڑکا رہائی کے لئے روتا تھا اور مولوی کہتا تھا کہ اُسے جلد رہا کر دیا جائے گا۔ اگر وہ اس طرح روئے گا یا شور شرابہ کرے گا تو اُسے قتل کر دیا جائے گا۔

خالد رات کو مولوی کے گھر جاتا تھا لیکن وہ کمرے میں لڑکے کو دیکھنے

کے لئے کبھی نہیں گیا تھا۔ یہ دیہاتی مکانوں جیسا کچا مکان تھا۔ مولوی کی بیوی تھی اور دو بچے بھی تھے۔ خالد کے کہنے کے مطابق اُس نے بیوی کو اُس کے ماں باپ کے گھر بھیج دیا تھا۔ سراج بھی رات کو اسی گھر میں سوتا تھا۔ میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مولوی نے کہا کہ انہیں پکڑے جانے کا کوئی ڈر نہیں تھا کیونکہ اُن کے سر پر اُن کے آقا کا ہاتھ تھا۔

"آٹھ دس دن بعد رات کا واقعہ ہے" — مولوی نے سنایا — "میں اور سراج صحن میں بیٹھے ہوتے تھے کہ خالد میاں آگئے۔ ہر روز کی طرح انہوں نے لڑکے کا حال احوال پوچھا اور بیٹھ گئے۔ میں نے انہیں کہا کہ مائی باپ، ایسا نہ ہو کہ پولیس کسی دن اچانک آ چھاپہ مارے۔ خالد میاں نے بتایا کہ انہوں نے تھانیدار کو اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ پولیس کا کوئی خطرہ نہیں۔ خالد میاں ہمارے ساتھ گپ شپ کرتے رہے۔ وہ ذرا نشے میں تھے۔ ویسے ہی اُنہوں نے کوئی بات شروع کر دی اور ہم سُنتے رہے۔ تھوڑا ہی وقت گزرا ہوگا کہ باہر والا دروازہ بڑی زور سے کھلا۔ ہم صحن میں چارپائیوں پر بیٹھے ہوتے تھے۔ پاس ہی لالٹین جل رہی تھی۔ چار آدمی اندر آ گئے۔ ایک کے ہاتھ میں دونالی بندوق تھی۔ باقی تینوں میں سے دو کے ہاتھوں میں لمبے لمبے چاقو تھے اور ایک کے ہاتھ میں سیدھی تلوار تھی جسے کرچ کہتے ہیں اور وہ کم از کم ایک گز لمبی تھی ....

"بندوق والے نے بندوق کی نالی خالد میاں کے ساتھ لگا دی اور کہا کہ ہلنا نہیں۔ تلوار والا میرے اور سراج کے سر پر کھڑا ہو گیا۔ چاقوؤں والوں نے کمرے کے دروازے کی زنجیر کھولی۔ اُن میں سے ایک کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ لڑکا سویا ہُوا ہے۔ وہ اندر گئے اور لڑکے کو جگا کر لے آئے۔ لڑکا بہت گھبرایا ہُوا تھا۔ اُس نے ایک آدمی کی طرف دیکھا اور 'بھائی جان' کہہ کر اُس کی طرف دوڑا۔ یہ وہ آدمی تھا جس کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ لڑکا اُس کے گلے لگ گیا۔ اُس آدمی نے لڑکے کو اپنے ایک بازو کے گھیرے میں لے لیا ...

"میں اس جوان آدمی کو جانتا تھا۔ یہ اپنے باپ کے ساتھ اس بیوہ کے گھر لڑکے کے اغوا کے تیسرے چوتھے روز آیا تھا۔ ہم نے ٹوہ لگائی تھی۔ لڑکے کی ماں نے اپنے ایک مزارعے کو پیغام دے کر شہر بھیجا تھا کہ لڑکا لاپتہ ہو گیا ہے۔ یہ آدمی نوروز کا منگیتر تھا۔ اس کے ساتھ اس کا بڑا بھائی اور باپ آئے تھے۔ خالد میاں کے حکم سے ہم ان کو دیکھتے رہتے تھے۔ وہ کئی بار تھانے بھی گئے تھے۔ پھر دونوں بھائیوں میں سے ایک یہاں سے چلا گیا تھا۔ دوسرے دن وہ دو آدمیوں کے ساتھ واپس آگیا۔ اس کے دو روز بعد یہ واقعہ ہُوا۔ ان آدمیوں نے خالد کو اور ہمیں بڑی سخت دھمکیاں دیں۔ ایک نے یہ بھی کہا کہ وہ یہاں سے سیدھے پولیس کے سب سے بڑے افسر کے پاس جا رہے ہیں ....

"حضور! ہم یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے کہ خالد میاں جیسا جابر آدمی ان کی منتیں کرنے لگا کہ انہیں لڑکا صحیح سلامت مل گیا ہے۔ پولیس کے پاس نہ جاؤ۔ وہ جب سب باہر نکلے تو خالد میاں بھی اُن کے ساتھ نکل گئے۔ میں اور سراج ساری رات ڈرتے رہے۔ اگلے دن ہم تینوں خالد میاں کے گھر گئے اور پوچھا کہ خطرہ ٹل گیا ہے یا نہیں۔ انہوں نے ہمیں تسلی دی اور بتایا کہ لڑکے والے خالد میاں کے پاس آ رہے ہیں اور کوئی تصفیہ ہو جائے گا۔ پھر ہم نے دیکھا کہ لڑکی کے منگیتر کا باپ اور بھائی خالد میاں کے پاس آتے۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ ان کے درمیان کیا باتیں ہوتیں۔ خالد میاں نے شام کو تسلی دی کہ معاملہ رفع دفع ہو گیا ہے۔"

میں نے مولوی سے بہت سی باتیں پوچھیں۔ اُس کے جوابوں سے کئی سوال نکلے۔ وہ جو کچھ جانتا تھا وہ بتاتا رہا۔ پتہ چلا کہ جتنی دیر لڑکا ان کی قید میں رہا تھا، نوروز مقتول کے پاس روزانہ آتی رہی۔

میں طلاق نہیں لے سکتی

اس کے بعد میں نے سراج کو بلایا۔ اُس نے بالکل یہی بیان دیا جو مولوی

کی طرح ہی میری منت سماجت کی کہ میں اُسے گرفتار نہ کروں۔ میں اُس کا بیان سنانا ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ یہ بیان آپ مولوی کی زبانی سُن چکے ہیں۔ میں نے مولوی سے بھی پوچھا تھا اور سراج سے بھی پوچھا کہ لڑکے کی نشاندہی کس نے کی تھی۔ دونوں میرے اس سوال کا جواب نہ دے سکے۔ سراج نے اپنی رائے یہ دی کہ جس طرح اُس کے آقا نے جاسوس رکھے ہوتے تھے ویسے ہی جاسوس لڑکے والوں کے پاس بھی ہوں گے۔ وہ بھی مقتول کی طرح کے لوگ تھے۔ میں البتہ اس بات پر حیران ہو رہا تھا کہ لڑکے والے چُپ کیوں ہو گئے۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد تک انہوں نے کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ یہاں سے مجھے شک پیدا ہُوا کہ انہوں نے یہ یقین کر کے کہ لڑکے کو مقتول نے اغوا کرایا تھا، لڑائی جھگڑے کی بجائے مقتول کو کسی دھوکے میں لا کر زہر دے دیا۔

میں نے ان سب لوگوں کو جو بلاتے تھے وہیں بیٹھا رہنے دیا۔ دونوں ہیڈ کانسٹیبلوں کو ان پر چھوڑا اور میں اکیلا ہی نوروز کے گھر جا پہنچا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ ماں بیٹی مجھے دیکھ کر پھر اُسی طرح گھبرائیں جس طرح پہلے گھبرائی تھیں۔ میں نے انہیں پھر تسلی دی۔ اب میرا لب ولہجہ اور انداز کچھ اور تھا۔ یہ نہ سمجھیں کہ میں اُن پر رُعب جھاڑ رہا تھا۔ اتنا تو میں سمجھتا تھا کہ خالد نے نوروز کو اپنے قبضے میں لینے کے لئے اُس کے بھائی کو اغوا کرایا تھا۔

"آپ معزز خاندان کی خواتین ہیں" ـــــ میں نے کہا ـــــ "میں پولیس کی اُس برانچ سے تعلق رکھتا ہوں جسے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ بڑے سے بڑے افسر کو بھی جہاں چاہے لے جا سکتی ہے۔ میں آپ لوگوں کی عزت کر رہا ہوں اور آپ مجھے چکر دے رہی ہیں۔ کیا یہ اچھا لگے گا کہ میں آپ دونوں کو اور بچے کو تھانے میں بلاؤں اور وہاں بچے سے کہوں کہ وہ بیان دے کہ وہ کس طرح اغوا ہُوا تھا اور پھر آپ سے جواب طلبی کروں کہ آپ اتنا بڑا واقعہ مجھ سے چھپاتی کیوں ہیں؟ ..... میں آپ کی مدد کے لئے آیا ہوں۔"

میں یہ بات کر ہی رہا تھا کہ نوروز کی ماں کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ نوروز اندر چلی گئی۔ واپس آئی تو اُس نے ایک کاغذ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اس کاغذ پر لکھا تھا:

"بیس ہزار روپیہ دے دو اور اپنا لڑکا لے جاؤ۔ چار دن کے اندر اندر رقم نہ ملی تو اگلی صبح لڑکے کی لاش تمہارے کھیتوں میں پڑی مل جائے گی۔ اگر پولیس تک پہنچو گی تو لڑکے کی لاش بھی نہیں ملے گی۔ اگر بیس ہزار منظور ہے تو کاغذ کے ایک ٹکڑے پر صرف یہ لکھ دو کہ منظور ہے اور کاغذ کا یہ ٹکڑا رات کے وقت اپنے دروازے کے باہر رکھ کر اُوپر ایک پتھر رکھ دینا۔ اگر تم نے پولیس کو اطلاع دی تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ نقصان تمہارا ہوگا۔"

میں نے جب یہ تحریر پڑھی تو سب سے پہلے یہ خیال آیا کہ میں نے اسی ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر کہیں دیکھی ہے۔ میں ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ تو نہیں تھا لیکن اتنا تجربہ تھا کہ اصلی اور جعلی تحریر میں فرق معلوم کر لیتا تھا۔ سوچتے سوچتے یاد آ گیا کہ یہ ہاتھ اور تقریباً یہی قلم میں نے دو تین روز پہلے ہی دیکھا ہے۔ میں جب شہر میں مقتول کے گھر اُس کے کاغذات دیکھ رہا تھا تو اُس کی دو تین تحریریں دیکھی تھیں۔ یہ تحریر جو نوروز نے میرے آگے رکھی تھی یہ بلاشک وشبہ مقتول کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی۔ اب میں اس بات پر حیران ہُوا کہ مقتول تو دولت مند آدمی تھا، اُسے ایک لڑکے کو یرغمال میں رکھ کر رقم مانگنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے تھی۔ یہ بیس ہزار روپیہ آج کا نہیں تھا۔ اُس زمانے کا بیس ہزار روپیہ آج کے تین ساڑھے تین لاکھ روپے کے برابر بنتا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ ذہنیت مجرمانہ ہو جاتے تو مجرم یہ نہیں دیکھا کرتے کہ ان کی اپنی سوشل پوزیشن کیا ہے اور ان کے گھر میں کتنی دولت ہے۔

"کیا آپ مجھے پوری بات سنائیں گی؟" ـــــ میں نے ماں بیٹی سے پوچھا۔

"ہم بہت ڈری ہوتی ہیں"۔۔۔ نوروز کی ماں نے جواب دیا ۔۔۔ "ہم نے اپنے بچے کو سختی سے کہہ رکھا ہے کہ کسی کو نہ بتاتے کہ وہ اغوا ہُوا تھا اور کس طرح رہا ہُوا ہے"۔

میں نے انہیں ابھی یہ نہیں بتایا تھا کہ مجھے نوروز کے منگیتر اور اُس کے بھائی پر شک ہے کہ خالد کو انہوں نے زہر دیا ہے۔ یہ سارا کھیل میرے لئے ایک معمہ تھا۔ میں الفاظ میں شاید بیان نہیں کر سکا کہ ماں اور بیٹی کس قدر خوفزدہ تھیں۔ انہوں نے تفصیلاً بتایا کہ وہ خالد کے خاندان اور اُس کے پلے ہُوتے غنڈوں سے اور یہاں کے سکھ تھانیدار اور اُس کی پولیس سے کتنی ڈری ہوتی ہیں۔ اُن کی اس دہشت زدگی میں مزید اضافہ اس طرح ہو گیا تھا کہ خالد مارا گیا تھا۔ ان دونوں کو پتہ چل چکا تھا کہ خالد کو زہر دیا گیا ہے۔ نوروز کی ماں نے مجھے صاف الفاظ میں بتایا کہ وہ اس ڈر سے مری جا رہی ہیں کہ خالد کی موت کا الزام ان پر نہ آجاتے۔

میں نے انہیں بتایا کہ میں کسی تھانے کا تھانیدار نہیں بلکہ میں تھانے کے تھانیداروں کو بھی گرفتار کر کے سزا دلانے کا اختیار رکھتا ہوں۔ ماں بیٹی پر اپنا اعتماد پیدا کرنے کے لئے مجھے خاصا زور لگانا پڑا۔ میں نے انہیں کہا کہ میں اُن کا خوف ہمیشہ کے لئے رفع کر دوں گا۔ مختصر یہ کہ بڑی کوشش سے وہ اصل واقعہ سنانے پر آمادہ ہو گئیں۔ میں لے نوروز کی ماں سے کہا کہ وہ نوروز کو میرے پاس بیٹھی رہنے دے اور خود اندر چلی جاتے۔

نوروز کے متعلق پہلے بتا چکا ہوں کہ ذہین اور جرآت والی لڑکی تھی۔ اُس نے بات شروع ہی اس طرح کی خالد اُسے بُری نیت سے دوست بنانا چاہتا تھا چونکہ خالد اور نوروز ایک ہی سوشل حیثیت کے تھے اور لڑکی پردہ نشین نہیں تھی بلکہ کچھ آزاد خیال تھی اور اسے معلوم تھا کہ خالد شریف آدمی نہیں لیکن وہ سمجھتی تھی کہ خالد کم از کم اس کے ساتھ بدتمیزی نہیں کرے گا اس لئے وہ اُس کے ساتھ کچھ بے تکلف ہو گئی۔ خالد نے کھیتوں اور دیگر کاموں کے معاملے میں ان لوگوں کی مدد امداد شروع کر دی۔

ایک روز نوروز خالد کے مکان میں آئی ہوتی تھی۔ خالد نے اُس کے ساتھ اس قسم کی بے تکلفی شروع کر دی جس کی نوروز کو امید نہیں تھی۔ نوروز لے ہنستے ہنستے اُسے ٹالنا چاہا لیکن خالد ٹلتا نظر نہیں آتا تھا۔

"خالد صاحب!"۔۔۔ نوروز نے اُسے کہا ۔۔۔ "میں جس حد تک دوستی رکھنا چاہتی ہوں آپ اُس سے آگے نکل رہے ہیں۔ آپ اگر اپنی یہ تمام زمین میرے نام منتقل کر دیں تو بھی میں آپ کے ساتھ اپنی حد سے باہر نہیں نکلوں گی"۔

"پھر شادی کے لئے تیار ہو جاؤ"۔۔۔ خالد نے بے تکلفی سے کہا ۔۔۔ "تم شاید سمجھ نہیں سکیں کہ میرے دل میں تمہاری کتنی محبت ہے اور یہ محبت ایسی نہیں کہ تم ٹالو گی اور میں ٹل جاؤ گا۔ ساری زندگی کی رفاقت قبول کر لو"۔

"کیا آپ شادی شدہ نہیں؟"۔۔۔ نوروز نے پوچھا۔

"اُس سے تو میں پہلے ہی جان چُھڑا رہا ہوں"۔۔۔ خالد نے کہا ۔۔۔ "اور وہ مجھ سے تنگ ہے۔ تم ہاں کہو اور میں اُسے طلاق دے دوں گا"۔

"لیکن میں طلاق نہیں لے سکتی"۔۔۔ نوروز لے کہا۔

"کیا کہہ رہی ہو؟"۔۔۔ خالد نے حیران ہو کر کہا ۔۔۔ "تم شادی شدہ تو نہیں ہو"۔

"میری منگنی ہو چکی ہے خالد صاحب!"۔۔۔ نوروز نے کہا ۔۔۔ "اور منگنی اُس کے ساتھ ہوتی ہے جسے میں دل سے پسند کرتی ہوں۔ میں اُسے کبھی نہیں چھوڑوں گی"۔

اس کے باوجود خالد اُسے اپنی ہوس کے جال میں پھانسنے کی کوشش کرتا رہا۔ نوروز نے بڑی مشکل سے اُسے ٹالا اور اُٹھ کر چل پڑی۔ خالد نے اُس سے پوچھا کہ وہ کل کس وقت آتے گی۔

"اگر آپ وعدہ کریں کہ پھر کبھی آپ میرے ساتھ اس قسم کی بات نہیں کریں گے تو جس وقت آپ چاہیں گے آجاؤں گی"۔۔۔ نوروز نے کہا ۔۔۔ "مجھے بھی اس جنگل میں کسی کے ساتھ کی ضرورت ہے لیکن میری اس آزاد خیالی کو آپ کوتی دوسرا رنگ نہ دیں"۔

اگلے روز نوروز خالد کے ہاں نہ گئی خالد اس کے ہاں آگیا۔ نوروز نے اُسے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اُس نے بہت سوچا ہے۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ وہ خالد سے تعلقات توڑ لے۔

اس سے اگلے روز نوروز کا چھوٹا بھائی گھر سے نکلا اور واپس نہ آیا۔ رات بھر ماں بیٹی روتی اور اُس کا انتظار کرتی رہیں۔ انہوں نے اپنے مزارعوں کو ہر طرف دوڑا دیا تھا اور ہر طرف سے یہی جواب ملتا تھا کہ بچہ نہیں ملا۔ صبح دونوں علاقے کے تھانے میں چلی گئیں اور سکھ تھانیدار جوگندر سنگھ کو رپورٹ دی۔

نوروز نے مجھے بتایا کہ جوگندر سنگھ نے عام سے کاغذ پر رپورٹ لکھی۔ لڑکے کی عمر، حلیہ وغیرہ لکھا اور کہنے لگا کہ گھر جا کر آرام سے بیٹھو، لڑکا مل جائے گا۔ ماں بیٹی گھر آ گئیں لیکن انہیں چین کیسے آتا۔ دوپہر کو دونوں پھر تھانے چلی گئیں۔ جوگندر سنگھ کا رویہ کچھ اور بدلا ہُوا تھا۔

"تم لوگ پولیس والوں کو خواہ مخواہ پریشان کرتے ہو"—— جوگندر سنگھ نے انہیں کہا —— "اپنے لڑکوں کو تم لوگ لگام ڈال کر نہیں رکھتے۔ وہ آوارہ ہو جاتے ہیں۔ عیاشی کرنے کے لئے شہروں کو چلے جاتے ہیں اور تھانے میں آ کر رپورٹ لکھواتے ہیں کہ لڑکا لاپتہ ہو گیا ہے .... بار بار تھانے مت آؤ۔ میں لڑکے کو ڈھونڈنے کا انتظام کر رہا ہوں۔ مل گیا تو تمہیں اطلاع دے دی جائے گی۔"

آپ تصور میں لا سکتے ہیں کہ ماں اور بہن کی جذباتی حالت کیا ہوتی ہو گی۔ یہ ماں کا اکلوتا بیٹا تھا اور اس کا باپ مر چکا تھا۔

میری عصمت اور میرا پیارا بھائی

وہ رات ماں بیٹی نے آنکھوں میں کاٹی۔ صبح اُٹھ کر باہر نکلیں تو باہر والے دروازے کی درز میں یہ رقعہ تہہ کیا ہُوا ملا جس کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے۔

اب تو ان بے چاریوں کی حالت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ ماں کو تو غشی آنے لگی۔ نوروز اکیلی خالد کے ہاں چلی گئی اور اُسے یہ رقعہ دیا۔ خالد نے رقعہ بڑی زور سے میز پر پھینکا اور کہنے لگا کہ وہ بچے کا ایک پیسہ ادا نہیں کرے گا اور بچہ زندہ و سلامت لے کر آئے گا۔

"نہیں خالد صاحب!"—— نوروز نے روتے ہوئے کہا —— "وہ بچے کو مار ڈالیں گے۔"

"میری موجودگی میں بچے کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا"—— خالد نے کہا۔ "میں بچے کو لاؤں گا۔ پیسہ ایک نہیں دوں گا۔"

نوروز نے اُسے بتایا کہ تھانیدار نے کیا جواب دیا ہے۔

"میں اس سکھ کو بھی گرفتار کرا دوں گا"—— خالد نے کہا —— "وہ تمہیں ٹال رہا ہے۔ یہ لوگ مجرموں سے ملے ہو۔ تے ہوتے ہیں۔"

اس دوران نوروز کی ماں نے ایک مزارعہ کو نوروز کے ہونے والے سسرال کو پیغام دینے کے لئے روانہ کر دیا تھا۔ ماں بیٹی کے رشتے کے جو لوگ زندہ تھے وہ بڑی دُور کی رشتہ داریاں تھیں۔ انہیں اس کے ساتھ اتنی ہمدردی نہیں ہو سکتی تھی۔ نوروز کا منگیتر اور اُس کے لواحقین اچھے لوگ تھے۔ اس سے ایک روز پہلے خالد نوروز کو تھانے لے گیا تھا اور ویسے ہی تھانیدار کے ساتھ بات چیت کر کے اُسے واپس لے آیا تھا۔ شام کے وقت ماں بیٹی خود تھانیدار کے پاس گئی تھیں۔

شام کو نوروز پھر اکیلی خالد کے ہاں جا پہنچی۔ اُسے ماں گھر ٹکنے نہیں دیتی تھی۔ بار بار کہتی تھی کہ خالد کے پاس جاؤ۔ اب دونوں ماں بیٹی یہ رقعہ ملنے کے بعد تھانے نہیں جاتی تھیں۔ ڈرتی تھیں کہ بچے کو اغوا کرنے والوں نے دیکھ لیا تو وہ بچے کو قتل کر دیں گے۔ نوروز خالد کے ہاں گئی اور اپنے بھائی کا رونا رونے لگی۔ خالد نے پھر اُسے تسلیاں دیں اور کہا کہ چند گھنٹوں میں اُس نے معلوم کر لیا ہے کہ لڑکا کہاں ہے اور اب وہ سوچ رہا ہے کہ وہاں کس طرح حملہ کرے اور لڑکے کو زندہ نکال لاتے۔

"نہیں خالد صاحب!" — نوروز نے روتے ہوئے کہا — "کچھ نہ کرنا۔ مجھے اپنا بھائی زندہ چاہیئے۔ یہ میرا ایک ہی بھائی ہے۔ آپ نہیں جانتے کہ مجھے اس سے کتنی محبت ہے۔"

"کیا تم بیس ہزار روپے دینا چاہتی ہو؟"

"بیس ہزار روپے پورے کرنے کے لئے آپ کی مدد کی ضرورت ہے" — نوروز نے کہا — "آپ ہماری کچھ زمین خرید لیں اور کل شام تک بیس ہزار روپیہ مجھے دے دیں یا بیس ہزار روپیہ قرض دے دیں جو میں یہ فصل کٹتے ہی ادا کر دوں گی۔"

دونوں کچھ دیر اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ نوروز نے مجھے جو باتیں سنائیں، ان سے میں اندازہ کرتا رہا کہ خالد اس لڑکی کو کس مقام پر لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کرتے کرتے وہ اپنی اصل بات پر آگیا۔

"روزی!" — خالد نے اُسے کہا — "بیس ہزار معمولی بات ہے۔ کل شام تک تمہارا بھائی تمہارے پاس ہوگا۔ میری محبت کی تھوڑی سی قیمت ادا کر دو۔"

خالد نے وہی قیمت بتائی جو نوروز کو منظور نہیں تھی۔ خالد نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ اُسے کس مقصد کے لئے چاہتا ہے۔

"انسپکٹر صاحب!" — روزی نے مجھے بیان دیتے ہوئے کہا — "ایک طرف میری عصمت تھی اور دوسری طرف میرا پیارا بھائی تھا۔ میں سوچ میں پڑ گئی کہ ان دونوں میں سے کس سے دستبردار ہو جاؤں" — اُن لمحوں کا ذکر کرتے ہوتے نوروز کی آنکھوں میں آنسو آگئے کہنے لگی — "اگر میرے پاس پستول ہوتا تو میں خودکشی کر لیتی۔ خالد نے مجھے بازو سے پکڑ کر اپنے پاس پلنگ پر بٹھا لیا تھا۔ میں تو یہ فیصلہ بھی نہ کر سکی کہ اس سے دُور رہوں یا اور قریب ہو جاؤں۔ میرے دل سے ایک ہُوک سی اُٹھی اور مجھے خدا یاد آیا۔ میرا خیال ہے کہ میں بھائی کی خاطر پھسل چلی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ خالد نے بڑے غصے سے کہا کہ کون ہے اوئے! باہر سے میرے ایک

مزارعہ کی آواز آئی کہ بی بی کے مہمان آگئے ہیں۔ انہیں جلدی گھر بھیج دیں.... خالد نے بڑی زور سے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے پوچھا کہ جلدی آؤ گی؟ میں کوئی جواب دیئے بغیر باہر نکل گئی۔"

وہ گھر گئی تو اُس کا منگیتر، منگیتر کا بڑا بھائی اور ان کا باپ آیا ہُوا تھا۔ دونالی بندوق وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ یہ لوگ اگلی صبح خالد سے ملے۔ خالد نے انہیں بھی تسلیاں دیں کہ لڑکا مل جائے گا۔

"خالد صاحب!" — نوروز کے ہونے والے سُسر نے کہا — "روزی بتاتی ہے کہ آپ کو معلوم ہے لڑکا کہاں ہے۔ ہم اغوا کرنے والوں سے ڈرتے ہیں کہ وہ لڑکے کو نقصان پہنچا دیں گے اس لئے ہم پولیس کے پاس نہیں جا رہے۔ آپ اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں؟"

نوروز بھی ان کے ساتھ آئی تھی۔ خالد نے ان لوگوں کو ایسا جواب دیا جس سے وہ کچھ مطمئن ہو گئے۔ جواب کچھ اس قسم کا تھا کہ ایک دو دن اور انتظار کر لیں۔ یہ سب وہاں سے اُٹھ گئے۔ میرے پوچھنے پر نوروز نے بتایا کہ اُسے بالکل شک نہیں ہُوا کہ خالد نے اُسے پھانسنے کے لئے اُس کے بھائی کو خود ہی اغوا کرایا تھا۔

"میری حالت تو پاگلوں جیسی ہو رہی تھی انسپکٹر صاحب!" — اُس نے کہا — "ذہن میں صرف بھائی تھا اور بیس ہزار روپیہ۔"

شام کے بعد روزی، اُس کی ماں اور اُن کے یہ مہمان بیٹھے یہ سوچ رہے تھے بلکہ فیصلہ کر چکے تھے کہ بیس ہزار روپیہ ادا کر دیا جائے۔ نوروز کے منگیتر نے کہا کہ آج رات ایک کاغذ پر لکھ کر باہر رکھ دیتے ہیں کہ منظور ہے۔ اتنے میں ایک عورت اُن کے گھر آئی۔ وہ خالد کے مزارعوں میں سے تھی۔

اُس کا نام تو کچھ اور تھا لیکن وہاں سب اُسے جوگن کہتے تھے۔ وہ نوروز اور اُس کی ماں کو الگ لے گئی۔

"کیوں پریشان ہوتی ہو بیٹیو!" — اُس نے کہا — "کسی کو یہ نہ بتانا کہ یہ بات میں نے تمہیں بتائی ہے۔ تمہارا بچہ یہیں ہے۔ میں یہ نہیں بتا سکتی کہ

بچے کو کیوں اغوا کیا گیا ہے لیکن بچہ تمہارا جہاں ہے وہ صاف بتا دوں گی .... خالد کا ایک مزارعہ ہے جس کا نام مولوی ہے۔ تمہارا بچہ اُس کے گھر میں ہے۔ اگر تم خالد سے کہو گی کہ بچہ واپس کر دے تو وہ نہیں کرے گا۔ تم نہیں جانتیں کہ وہ اپنے باپ کی اولاد نہیں، شیطان کی نسل سے ہے۔ آگے تمہاری ہمت ہے کہ بچے کو وہاں سے کس طرح نکلواتی ہو۔"

اُس عورت نے اُن کے ساتھ بہت سی باتیں کیں۔ پھر اُس نے یہی باتیں نوروز کے منگیتر وغیرہ کو بتائیں۔ منگیتر کے باپ نے کہا کہ جوگن اُسے مولوی کا گھر دکھا دے۔

رات کا وقت تھا۔ جوگن نوروز کے منگیتر کو دُور کا چکر کاٹ کر ساتھ لے گئی اور مولوی کا مکان دکھا دیا۔ دُور کا چکر کاٹنے کا مقصد یہ تھا کہ خالد کا گھر سیدھے راستے میں آتا تھا۔ جوگن نے یہ بھی بتایا کہ خالد رات کو وہاں جاتا ہے۔ مکان کا نقشہ بھی سمجھایا۔ وہ سیدھا سادا مکان تھا۔ پہلو بہ پہلو دو کمرے تھے اور آگے صحن تھا۔ صحن کی دیوار کچی تھی۔ جوگن نے نوروز کے منگیتر کو بڑی اچھی طرح گھر کے اندر کا نقشہ بتا دیا۔ یہ کوئی محل نہیں تھا، بنگلہ نہیں تھا اور یہ حویلی بھی نہیں تھی۔

نوروز کا منگیتر اُسی رات وہاں سے چلا گیا۔ رات گیارہ بجے ایک ریل گاڑی گزرتی تھی۔ منگیتر صبح اپنے شہر پہنچ گیا۔ اُس نے اپنی برادری اور رشتہ داری کے دو دلیر اور بدمعاش قسم کے دوست اپنے ساتھ لئے اور اُسی روز واپس آگیا۔ وہ رات نو بجے کے لگ بھگ اراضی پر واپس آیا۔

میں یہ سن کر حیران ہُوا کہ اُس نے یہ انتظام اتنی تیزی سے کیا کہ رات گیا اور دوسری رات آ بھی گیا۔ اراضی کی جگہ سے ریلوے سٹیشن تک لاری جاتی تھی۔ یہ اُسے جلدی مل گئی۔ آخری لاری جا رہی تھی۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ واپسی پر ریلوے سٹیشن سے اس طرف آنے والی لاری کو چلنے میں ابھی بہت وقت تھا۔ سواریاں پوری ہو جانے پہ لاری چلا کرتی تھی۔ یہ امیر کبیر لوگ تھے۔ ان تینوں نے سالم لاری لے لی۔ ڈرائیور کو پیسے دے کر کہا کہ وہ اُڑتا

ہُوا چلے۔ ڈرائیور نے لاری اڑا کر دکھا دی اور انہیں منزل پر پہنچا دیا۔

جوگن نے نشاندہی کیوں کی؟

"ہمیں اور امی نہیں چاہتی تھیں کہ یہ طریقہ اختیار کیا جاتے" — نوروز نے مجھے بیان دیتے ہوئے کہا — "ہم ڈرتی تھیں کہ میرا منگیتر اور اُس کے دوست وہاں پہنچیں گے تو جن کے پاس میرا بھائی ہے وہ اُسے قتل کر کے بھاگ جائیں گے لیکن میرا منگیتر تو کوئی بات سنتا ہی نہیں تھا۔ امی نے اُسے کہا کہ اس عورت پر اعتبار کر لینا بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔ جوگن کو اُن بدمعاشوں نے خود بھیجا ہو گا اور یہ ایک جال ہے لیکن میرا منگیتر کہتا تھا کہ لڑکا وہیں ہے اور اُسے خالد نے اغوا کرایا ہے"۔

"معلوم ہوتا ہے تمہارا منگیتر جوشیلا اور جذباتی نوجوان ہے" — میں نے ہنستے ہوئے کہا — "یا وہ بیوقوف ہے۔ یہ تو خوش قسمتی تھی کہ لڑکا مل گیا ہے۔ اُسے ایک اجنبی عورت پر اعتبار نہیں کرنا چاہیئے تھا"۔

"وہ جوشیلا بھی ہے، جذباتی بھی ہے اور جرأت مند بھی ہے" — نوروز نے کہا — "لیکن وہ بیوقوف نہیں۔ اُس نے اس لئے جوگن کی یہ بات فوراً مان لی تھی کہ میرے بھائی کو خالد نے اغوا کرایا ہے کہ میں نے اُسے الگ بٹھا کر بتایا تھا کہ خالد کس طرح مجھ پر جال پھینکتا رہا ہے۔ میں نے آپ کو جو باتیں سنائی ہیں وہ اُسے بھی سناتی تھیں اور اُس نے فوراً کہہ دیا تھا کہ یہ خالد کی سازش ہے۔ مجھے یہ بھی خطرہ نظر آنے لگا تھا کہ یہ جوش اور غصے میں خالد کو ہی قتل نہ کر دے ....

"میرے منگیتر کے والد صاحب بھی اپنے بیٹے کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی دونالی بندوق انہیں دے دی۔ میری اور امی کی حالت ان چاروں کے چلے جانے کے بعد یہ ہو گئی کہ ہم خوف سے کانپتی رہیں۔ ہم نے جو ایک گھنٹہ گزارا وہ ایک سال جتنا لمبا تھا۔ آخر وہ

میرے بھائی کو لے کر آ گئے۔ اُنہوں نے ہمیں سنایا کہ وہ کس طرح اس مکان میں داخل ہوئے۔ خالد وہاں موجود تھا۔ پھر انہوں نے جس کمرے کا دروازہ بند دیکھا وہ کھول کر اندر چلے گئے۔ میرا بھائی اسی کمرے میں تھا۔"

اس کے بعد نوروز نے مجھے وہ بات سنائی جو اُسے منگیتر وغیرہ نے سنائی تھی کہ وہ لڑکے کو کس طرح نکال لائے اور خالد کے ساتھ کیا باتیں اور کیا تصفیہ ہُوا۔ میں آپ کو یہ سارا واقعہ خالد کے مزارعہ مولوی کی زبانی سُنا چکا ہوں۔

میں نے یہ واقعہ نوروز کے منگیتر سے بھی ابھی سنا تھا۔ میں نے نوروز سے پوچھا کہ وہ مجھ سے کیوں چھپاتی رہی ہیں کہ اُن کے گھر میں اتنا بڑا واقعہ ہو گیا تھا۔

"انسپکٹر صاحب!" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "آپ پولیس انسپکٹر ہیں۔ آپ حالات کو اور انسانوں کو کسی اور نظر سے دیکھتے ہیں، ہماری نظر کچھ اور ہے کیونکہ ہم حالات اور بُرے انسانوں کی زد میں آئے ہوئے لوگ ہیں۔ سکھ تھانیدار کے رویے سے ہمیں پتہ چل گیا تھا کہ وہ مجرموں کے ساتھ ملا ہُوا ہے اور مجرموں کی نیت بھی معلوم ہو گئی تھی۔ بھائی کے واپس آ جانے کے بعد ہم پہلے سے زیادہ ڈرتی رہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خالد نے میرے منگیتر کے آگے ہتھیار ڈال تو دیئے تھے لیکن اُس پر یہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ سامنے آ کر یا درپردہ جوابی کارروائی نہیں کرے گا۔ میری امی نے میرے ہونے والے سُسر سے کہا تھا کہ ہم یہاں نہ رہیں۔ انہوں نے کہا کہ تم یہیں رہو گی اور اکیلی رہو گی۔ ہم دیکھیں گے کوئی کیا کرتا ہے ....

"اس کے ساتھ ہی انہوں نے کہا تھا کہ اس واقعہ کا ذکر کسی کے ساتھ نہ ہو تا کہ خالد کو بہانہ نہ ملے کہ اُسے رُسوا کیا جا رہا ہے۔ تھانیدار کا بھی کوئی بھروسہ نہیں تھا جب آپ آئے تو ہم اس لئے ڈر گئیں کہ آپ کو اگر یہ واقعہ سنا دیا تو آپ بھی اپنے محکمے کا ساتھ دیں گے اور اس سکھ تھانیدار کی دھاندلی پر پردہ ڈالیں گے۔"

اس لڑکی نے یہ واقعہ تو سارے کا سارا سنا دیا لیکن میں اس واقعہ کی تفتیش کے لئے نہیں آیا تھا نہ ہی میرے پاس اس لڑکے کے اغوا کی کوئی رپورٹ تھی۔ میرا مسئلہ جوں کا توں میرے سامنے موجود تھا اور یہ سوال مجھے پریشان کر رہا تھا، کیا خالد کو نوروز کے منگیتر نے زہر دیا یا دلایا ہے؛ اس کے ساتھ ہی یہ شک بھی میرے ذہن میں آیا کہ نوروز کوئی بدھو اور عام سی لڑکی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اُس نے اپنی بے عزتی کا اور اپنے بھائی کے اغوا کا انتقام لینے کے لئے اپنے منگیتر کی شہ پر خالد کو دوستی کا جھانسہ دے کر اُسے زہر دے دیا ہو۔

"تم خالد کے ہاں اس کے بعد بھی گئی تھیں" ـــــ میں نے ایسے لہجے میں کہا جیسے مجھے یقین تھا کہ وہ وہاں گئی ہو گی۔

"اتنے بڑے واقعہ کے بعد وہاں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا" ـــــ نوروز نے جواب دیا ـــــ "میں تو اُس کی صورت بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتی تھی۔"

"میرا خیال ہے کہ تم ایک بار وہاں گئی ہو" ـــــ میں نے کہا

"اور میرا خیال ہے انسپکٹر صاحب!" ـــــ اُس نے کہا ـــــ [illegible] کو سمجھتے ہیں جو ہمارے لئے پیدا کر دیئے گئے تھے نہ آپ [illegible] سمجھ سکے ہیں.... معلوم نہیں آپ یہ خیال کہاں سے لے آتے ہیں۔ میں بھلا اُس کے پاس جانے کی جرأت کر سکتی تھی؛ اُس کے ساتھ تو باقاعدہ دشمنی پیدا ہو گئی تھی۔ میں جاتی تو وہ مجھ سے انتقام لیتا۔ مجھے ہی غائب کر دیتا۔ اُس کے ہاں جانے کا مقصد ہی کوئی نہیں رہا تھا۔"

میں نے ہر پہلو سے اُس پر حملہ کیا۔ اُس کے ہر جواب کو بڑی غور سے سُنا۔ جوابوں میں سے سوال نکالے لیکن اُس کی خود اعتمادی اور ذہانت کو دیکھ کر مجھے یہ ماننا پڑا کہ خالد کو اس نے زہر نہیں دیا، لیکن میں ابھی یہ ماننے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا کہ خالد کی زہر خورانی کا تعلق لڑکے کے اغوا کے ساتھ نہیں۔ اُسے اسی سلسلے میں زہر دیا گیا تھا۔

"تمہیں یہ تو معلوم ہو گا کہ خالد یہاں سے کب شہر گیا تھا؟" — میں نے نوروز سے پوچھا۔

"تیسرے چوتھے روز پتہ چلا تھا کہ وہ یہاں سے چلا گیا ہے" — نوروز نے جواب دیا — "پھر کچھ دنوں بعد پتہ چلا کہ وہ مر گیا ہے اور یہ بھی سُنا کہ اُس کی موت زہر سے واقع ہوتی ہے۔"

اس لڑکی کے بعد میں نے اُس کے بھائی کو اپنے پاس بٹھایا اور اُس کا بیان لیا۔ اُس کا بیان اتنا سا ہی تھا کہ خالد کے مزارعہ، مولوی نے اُسے کہا کہ فلاں جگہ جاؤ۔ وہاں کبوتر اور فاختہ ہیں۔ لڑکا دوڑتا وہاں پہنچا۔ اُس کے پاس غلیل تھی۔ وہاں وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا تو کسی نے اُس پر کپڑا پھینکا اور اُسے اُٹھا کر لے گئے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُسے کہاں لے گئے تھے۔ اُس نے بتایا کہ پہلے اُسے ایک مکان میں لے گئے پھر آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک گھوڑے پر بٹھایا اور بہت دُور لے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے اُسے ایک مکان میں رکھا اور اُسے بڑا اچھا کھانا دیتے رہے۔

میں نے آپ کو پہلے بتایا ہے کہ اُسے گھوڑے پر بٹھا کر وہیں گھماتے پھراتے رہے جس سے وہ یہ سمجھا کہ اُسے بہت دُور لے جایا جا رہا ہے۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ اُسے سوائے قید کے کوئی اور تکلیف نہیں دی گئی۔ مختصر یہ کہ اس لڑکے سے مجھے اپنے کام کی کوئی بات معلوم نہ ہوتی۔ میں نے اس سے بھی معلوم کرنے کی کوشش کی کہ نوروز اس کے بعد بھی خالد کے ہاں گئی تھی یا وہ خالد کو پھر بھی ملا تھا۔ لڑکے نے بڑا پختہ جواب دیا کہ نوروز کے ہونے والے سُسر نے بڑی سختی سے کہا تھا کہ خالد کی اراضی کی حدود میں قدم بھی نہ رکھنا۔

میں بھی ماں ہوں

نوروز کی ماں کے ساتھ جو باتیں ہوئیں وہ ویسی ہی تھیں جیسی نوروز نے سنائی تھیں۔ وہ اب بھی ڈری ہوئی تھی۔ میں نے اُسے بہت تسلیاں

دیں اور وہاں سے اُٹھ آیا۔ راستے میں یہی معمہ میرے ذہن میں کلبلاتا رہا کہ خالد کو زہر کس نے دیا۔ پھر یہ عورت جس کا نام جوگن بتایا گیا تھا میرے ذہن میں آگئی۔ تفتیش کا یہ مرحلہ بہت صبر آزما ہوتا ہے۔ عقل ایسے امتحان میں پڑ جاتی ہے جو عقل کو مار دیتا ہے۔ سوال یہ میرے سامنے آیا کہ اس عورت نے لڑکے کی نشاندہی کیوں کی۔ اُسے معلوم تھا کہ لڑکا فلاں جگہ ہے تو یہ ایک ثبوت تھا کہ وہ لڑکے کے اغوا میں شامل تھی۔ اگر شامل تھی تو اُس نے نشاندہی کیوں کی؟ کیا اُس کی خالد سے کوئی دشمنی تھی یا ان دونوں مزارعوں سے؟ سوچ سوچ کر میں نے ضروری سمجھا کہ اس عورت کے ساتھ گفتگو کر لی جائے۔ میں نے خالد کے مکان میں جسے میں نے اب تفتیش کا ہیڈ کوارٹر بنا لیا تھا، پہنچتے ہی جوگن کو طلب کیا۔

جوگن کے آنے تک میں نے رام سہاتے سے پوچھا کہ وہ جوگن کو جانتا ہے؟

"اُسے کون نہیں جانتا حضور!" — اُس نے جواب دیا — "بڑی گہری اور بڑی تیز عورت ہے۔ جیسا چکر کہو چلا کر دکھا دے گی۔ جاگیر دار (خالد) کے مُنہ چڑھی ہوتی تھی۔ اپنی جوانی تو اُس نے جیسے گزاری وہ سب جانتے ہیں لیکن اب اُس کی چالاکیوں کے رنگ ڈھنگ بدل گئے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کی بیٹی جوان ہو گئی ہے اور بڑی خوبصورت نکلی ہے۔ جوگن سائے کی طرح اُسے اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اُس کی بیٹی کہیں خجل خراب نہ ہو اور باعزت طریقے سے ڈولی میں بیٹھ کر چلی جائے۔ اُس کی ساری اولاد بھی ایک بیٹی ہے۔"

"اُس کا خاوند یہاں مزارعہ ہو گا؟"

"نہیں حضور!" — رام سہاتے نے جواب دیا — "بیوہ ہے۔ سات آٹھ سال گزرے وہ مر گیا تھا .... اور حضور! لوگ کہتے تھے کہ جوگن نے اپنے خاوند کو زہر دے کر مارا تھا۔ وہ فوراً مر جاتا تو شاید یہ پکڑی بھی جاتی۔ اگر اُس نے زہر دیا ہی تھا تو ایسا زہر دیا جس سے اُس کے خاوند کو پہلے بیمار

کیا پھر وہ کچھ دن بعد مر گیا جس سے کسی کو شک نہ ہوا کہ مرنے والا زہر سے مرا ہے۔"

"کیا تمہیں یقین ہے؟"

"نہیں حضور!" ــــ رام سہاتے نے جواب دیا ــــ "کسی پر بغیر ثبوت کے الزام لگانا اچھا نہیں ہوتا۔ لوگ کہتے تھے .... اور حضور! لوگوں کے کہنے کا کیا ہے۔ جوگن اچھی شکل و صورت والی عورت تھی۔ ایسی بُری بھی نہیں تھی کہ جو کوئی اُسے بلاتا اُس کے ساتھ چل پڑتی۔ تھی تو مزارعوں کی بہو بیٹی لیکن طرح دار تھی اور چھوٹے موٹے آدمی کی طرف تو دیکھتی بھی نہیں تھی۔ جن لوگوں کے ہاتھ وہ نہیں آتی تھی، انہوں نے اُسے اس طرح بدنام کرنے کی کوشش کی ہو گی کہ اس نے اپنے خاوند کو زہر دیا ہے۔"

اس کے بعد میں نے شامے کو بلا کر جوگن کے متعلق پوچھا۔ اُس نے بھی رام سہاتے جیسی رائے دی۔ اُس نے بھی کہا کہ سُنا ہے جوگن نے اپنے خاوند کو زہر دیا ہے لیکن اُسے یقین نہیں تھا۔

"تم تو اُس کے متعلق اور بہت کچھ بتا سکتے ہو" ــــ میں نے کہا ــــ "تمہیں تو مالک نے ان لوگوں کا نمبردار بنا رکھا تھا۔"

"ہاں عالی جاہ!" ــــ اُس نے کہا ــــ "جتنا میں اُسے جانتا ہوں، شاید کوئی اور نہ جانتا ہو۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ جب سے اُس کی بیٹی جوان ہوتی ہے وہ بہت چوکس اور طبیعت کی سخت ہو گئی ہے۔"

"تم نے تو اس کے ساتھ بڑی گہری دوستی بھی گانٹھ رکھی ہو گی" ــــ میں نے کہا ــــ "دوستی کا مطلب سمجھتے ہو نا!"

"گہری دوستی نہ کہیں عالی جاہ!" ــــ اُس نے کہا اور کھسیانا سا ہو کر بولا ــــ "بس کبھی کبھار .... لیکن اب اپنی بیٹی کے معاملے میں وہ اتنی سخت ہو گئی ہے کہ خالد میاں اُس کی بیٹی کو محل بلاتے تھے تو جوگن خود ساتھ آتی تھی، ساتھ رہتی تھی اور بیٹی کو ساتھ لے جاتی تھی۔ میں تو خالد میاں کا خاص آدمی تھا۔ انہوں نے مجھے تین چار مرتبہ کہا تھا کہ تم اس عورت پر اپنا رعب نہیں جما سکتے، میرے

کہنے کے باوجود یہ اپنی بیٹی کو میرے پاس نہیں بھیجتی .... میں نے جوگن سے کہا تھا کہ اُس نے اپنی جوانی ایسے ہی گزاری تھی۔ اب اپنے مالک اُس کی بیٹی کو چاہتے ہیں تو اُسے خوش ہونا چاہیئے۔ انعام سے جھولی بھر دیں گے لیکن عالی جاہ! اس عورت نے قسم کھالی تھی کہ اپنی بیٹی کو ناپاک کر کے ڈولی میں نہیں بٹھائے گی۔"

جوگن کے متعلق میں نے معلومات لے لیں لیکن یہ شک کرنا غلط تھا کہ اس نے خالد کو زہر دیا ہو گا۔ شک نہ کرنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ جوگن غریب تھی اور خالد کا دیا کھاتی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میرا پختہ شک نوروز پر تھا اور اس میں نوروز کا منگیتر بھی شامل تھا۔

اتنے میں جوگن آ گئی اور میں نے اُسے کمرے میں اپنے پاس بٹھا لیا۔

میں نے اپنی کہانیوں میں ایک خاص قسم کی عورت کا ذکر اکثر کیا ہے۔ یہ عورت شہروں میں بھی ہوتی ہے جہاں وہ لوگوں کے گھروں میں کام کرتی ہے اور یہ عورت دیہات میں بھی ہوتی ہے۔ وہاں بھی امیر کبیر زمینداروں کے گھروں میں نوکرانی ہوتی ہے اور یہ عورت بڑے بڑے جاگیرداروں کے نوکروں اور مزارعوں میں بھی موجود ہوتی ہے۔ اس عورت کے انداز ہر جگہ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ چہرے مختلف ہوتے ہیں لیکن ان چہروں پر تاثر ایک جیسا ہوتا ہے۔ جوگن بالکل وہی عورت تھی۔ اُس کے نقش و نگار، باتیں کرتے وقت آنکھوں کے بدلتے ہوئے زاویے اور گردن کا خم بالکل وہی تھا۔ دیکھنے میں جوگن خوبصورت عورت رہی تھی، اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ بہت گہری عورت ہے۔

آپ نے میری کہانیوں میں اور دوسرے پولیس انسپکٹروں کی کہانیوں میں بھی یہ نوٹ کیا ہو گا کہ جرائم کی ہر کہانی میں جس لڑکی یا عورت کا ذکر آتا ہے وہ بہت خوبصورت ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے بعض پڑھنے والے یہ سوچتے ہوں کہ کہانی میں لذت اور چسکا پیدا کرنے کے لئے خوبصورت عورت لائی جاتی ہے۔ لیکن ذرا غور کریں کہ جرائم خصوصاً قتل اور اغوا خوبصورت عورت کی خاطر ہی کئے جاتے ہیں۔ عورت خوبصورت نہ ہو تو اُس کی خاطر کون پھانسی چڑھنا چاہے گا اور اُسے اغوا بھی کوئی نہیں کرے گا۔ بدصورت عورت خود کوئی جرم کر سکتی

بے لیکن جرم کا باعث نہیں بن سکتی۔

"تمہارے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں جوگن!" —— میں نے اُسے کہا —— "تم کوشش یہ کرنا کہ میں جو کچھ پوچھوں، وہ سچ سچ بتا دینا۔"

"آپ مجھے یہ تو نہیں بتائیں گے کہ آپ نے میرے متعلق کیا سُنا ہے" —— جوگن نے کہا —— "یہی سُنا ہوگا کہ جوگن بڑی خراب عورت ہے۔ آپ پولیس کے افسر ہیں۔ جو آپ کے مُنہ میں آتے وہ کہہ سکتے ہیں۔ غریب آدمی جُرم نہ کرے تو بھی مجرم ہے۔ آپ مجھ پر کوئی سا الزام تھوپ دیں، پھر میں آپ کا حکم مانوں گی کہ اقرار کروں یا انکار۔"

"نہ جوگن!" —— میں نے کہا —— "خواہ مخواہ الزام نہیں تھوپوں گا اور تھوپنے کے لئے میرے پاس کوئی الزام ہے بھی نہیں۔ میں نے تم سے ایک دو باتیں معلوم کرنی ہیں۔۔۔۔ اور میں تمہیں سچے دل سے یہ بتا دیتا ہوں کہ میرے دل میں تمہاری ہمدردی ہے۔ میں کوئی آسمان سے نہیں اُترا۔ تم جیسا انسان ہوں۔ نہ میں تمہیں کوئی چکر دوں گا نہ تم کوئی ہیرا پھیری کرنا۔"

اُس نے کچھ اور جذباتی باتیں کیں۔ میں آپ کو حقیقت بتاتا ہوں کہ میرے دل میں واقعی اُس کی ہمدردی پیدا ہو گئی تھی اس لئے میں نے اُس کی جذباتی باتوں کے جواب میں اُس سے زیادہ جذباتی اور ہمدردانہ باتیں کیں۔ ان کا ایسا اثر ہوا کہ اُس نے بے تکلفی سے بولنا شروع کر دیا۔ بے شک میں کچھ حد تک جذباتی ہو گیا تھا لیکن میں تفتیشی استادیوں سے دستبردار نہیں ہوا تھا۔ تھانیداروں والی استادیاں اور چالاکیاں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ ہمارے درمیان اس طرح کی گفتگو شروع ہو گئی تھی جیسے دو دوست بیٹھے دُکھ سُکھ بانٹ رہے ہوں۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُسے کس طرح پتہ چلا تھا کہ وہ لڑکا اغوا ہو کر اُس گھر میں آیا ہے۔

"جوگن!" —— میں نے کہا —— "تم نے یہ جو نیکی کی ہے یہ اکیلی تمہاری ساری عمر کے گناہ بخشوا دے گی۔ کسی ماں کا اکلوتا اور یتیم بچہ قید سے نکلوا کر اُس کی گود میں ڈال دینا معمولی نیکی نہیں۔ تمہیں اس کا اجر خدا دے گا اور

میں تمہیں اس کا صلہ یہ دے سکتا ہوں کہ تمہارے خلاف کوئی الزام میرے سامنے آیا تو میں اس پر لکیر پھیر دوں گا۔۔۔۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے گمشدہ لڑکے کی نشاندہی کیوں کر دی تھی۔ ظاہر ہے کہ تم اُن کے ساتھ تھیں۔"

"نہیں" —— جوگن نے جواب دیا —— "کسی ماں کا دل دکھانے کے لئے میں کسی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ یہ تو اُس بچے کی اور اُس کی ماں کی خوش قسمتی سمجھو کہ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ بچہ اس مکان میں ہے۔"

"کیسے پتہ چلا تھا؟"

"سراج اور مولوی ایک دن ایک بوری دونوں طرف سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے جا رہے تھے" —— اُس نے جواب دیا —— "انہوں نے مجھے نہ دیکھا۔ میں اپنے گھر کا دروازہ کھول کر نکلنے لگی تھی کہ کچھ یاد آ گیا تو پیچھے ہٹ گئی۔ اتنے میں وہ دونوں بوری اٹھاتے ہوئے دس بارہ قدم دُور سے گزرے۔ میں نے دیکھا کہ بوری میں کچھ ہل جل ہو رہی تھی۔ بوری میں کوئی بلی یا کتا نہیں تھا۔ جو کچھ بھی تھا وہ زندہ تھا اور اس میں بہت حرکت تھی۔ وہ مولوی کے گھر میں چلے گئے۔ رات کو مجھے گھوڑے کے قدموں اور آدمیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے دروازہ ذرا سا کھول کر دیکھا۔ چاندنی رات تھی۔ سراج اور مولوی ایک آدمی کو گھوڑی پر بٹھا رہے تھے۔ اس آدمی کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اُسے بٹھا کر لے گئے۔ میں نے کواڑ آہستہ سے بند کیا اور درز میں سے دیکھا۔ وہ ایک طرف چلے گئے۔ میں سوچتی رہی۔ بہت دیر بعد پھر گھوڑے کے قدموں کی آواز آئی۔ میں صحن میں دروازے کے ساتھ سوئی ہوئی تھی۔ میری آنکھ کھل گئی۔

"تمہاری نیند بڑی کچی معلوم ہوتی ہے جوگن!" —— میں نے کہا —— "باہر کی ہلکی ہلکی آوازوں میں سے دونوں دفعہ تمہاری آنکھ کھل گئی۔"

"کیا آپ جانتے ہیں کُتا کس طرح سوتا ہے؟" —— جوگن نے کہا —— "کہتے ہیں ایک آنکھ اور ایک کان کھول کر سوتا ہے۔ بڑی دُور کی آہٹ پر بھی جاگ اُٹھتا ہے۔ میری نیند کُتے جیسی ہے۔ یوں سمجھو کہ میں تو دونوں آنکھیں

کھول کر سوتی ہوں۔"

"وہ کیوں؟"

"بیٹی کی خاطر!" — اُس نے جواب دیا — "اپنی تو جیسی گزرنی تھی گزر گئی لیکن بیٹی کی عزت میرے لئے دِق کا مرض بن گئی ہے۔ غریبوں کی بچیوں کو خوبصورت نہیں ہونا چاہیئے۔ میں تو کہتی ہوں کہ اُنہیں جوان بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ پیدا ہوتے ہی بوڑھی ہو جائیں تو ہی اُن کی عزت محفوظ رہتی ہے۔ بس اس بچی کی خاطر راتوں کو آنکھ نہیں لگتی۔ ذرا سا کھٹکا ہو تو آنکھ کھُل جاتی ہے اور میں کہتی ہوں کہ کوئی میری بیٹی کو اُٹھانے آیا ہے.... گھوڑے کے قدموں کی آواز تو بڑی اونچی ہوتی ہے۔ دوسری بار آواز آئی تو میں نے کواڑ ذرا سا کھول کے دیکھا۔ سراج اور مولوی تھے۔ گھوڑے پر وہی آدمی بیٹھا تھا۔ اُس کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوتے تھے اور آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔ اُنہوں نے اُسے اُتارا۔ وہ آگے چل نہیں رہا تھا۔ اُسے انہوں نے بازوؤں اور ٹانگوں سے پکڑا اور اندر لے گئے۔ اسے انہوں نے جب اُتارا تھا اور وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ بڑی عمر کا آدمی نہیں تھا۔ قد اُس کا چھوٹا تھا....

"اگلے ہی روز سنا کہ ساتھ والوں کا لڑکا گم ہو گیا ہے۔ میں اُن کے گھر گئی اور ویسے ہی ہمدردی کرتے کرتے پوچھا کہ اُس نے کپڑے کس قسم کے پہنے ہوتے تھے۔ انہوں نے وہی کپڑے اور ان کا وہی رنگ بتایا جو رات کو میں نے دیکھا تھا۔ اس لڑکے کو میں نے پہلے بہت دفعہ دیکھا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ رات کو جسے میں نے دیکھا ہے وہ انہی کا لڑکا تھا۔ پھر میں نے مولوی کے گھر پہ نظر رکھی۔ رات کو خالد کو وہاں جاتے دیکھا۔ خالد میاں کبھی کسی نوکر یا مزارعہ کے گھر میں رات کو نہیں گیا تھا۔ مولوی کے گھر میں اُس کا کیا کام ہو سکتا تھا؟ جتنے دن لڑکا مولوی کے گھر میں رہا خالد میاں رات کو وہاں جاتا رہا۔ پھر میں نے یہ بھی دیکھا کہ مولوی یا سراج دونوں وقت خالد کے گھر سے ٹرے میں کھانا لاتے تھے۔ یہ کھانا ان مزارعوں کا تو نہیں ہوتا تھا۔ مجھے یقین

ہو گیا کہ لڑکا خالد نے اغوا کر کے مولوی کے گھر میں رکھا ہُوا ہے۔"

"تم تجربہ کار عورت ہو" — میں نے کہا — "تم نے یہ تو سوچا ہو گا کہ خالد نے اس لڑکے کو کیوں اغوا کرایا تھا۔"

"پہلے تو میں یہ سمجھی کہ لڑکا نوعمر اور خوبصورت ہے" — جوگن نے کہا — "لیکن مجھے ایک خیال آگیا۔ آخر میں بھی انہی لوگوں میں رہ رہی ہوں۔ خالد میاں نوروز کے پیچھے پڑے ہوتے تھے۔ ایک روز میں خالد میاں کے گھر گئی تو نوروز نکل کر جا رہی تھی۔ مجھ سے خالد میاں کچھ نہیں چھپاتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ پریشان تھے۔ میں نے پوچھا کہ طبیعت تو ٹھیک ہے۔ کہنے لگے — 'یہ تو سالی پتھر ہے' — میں نے کہا، آپ تو ہیروں کو کاٹ لیتے ہیں۔ خالد نے کہا، یہ ہیرا ہے تو بہت خوبصورت لیکن ہیروں سے بھی سخت ہے۔ میں نے کہا کہ میں کچھ خدمت کروں؟ کہنے لگے — 'نہیں، یہ تمہارے بس کی بات نہیں۔ میں خود ہی کچھ کرتا ہوں'....

"اس کے ایک دو روز بعد لڑکا اغوا ہُوا تو میں سمجھ گئی کہ یہ لڑکی کو پھانسنے کا طریقہ ہے" — اُس نے بڑی لمبی آہ لی اور کہنے لگی — "میں بھی ماں ہوں۔ میں نے اس لڑکے کی ماں اور بہن کو روتے دیکھا۔ پہلے تو میں سوچتی رہی کہ یہ کام کر گزروں یا چُپ رہوں لیکن ایک روز رہا نہ گیا۔ دل بہت اُداس تھا۔ میں نے بیٹی سے کہا کہ اندر سے کُنڈی لگا لو، میں ابھی آتی ہوں۔ میں گئی اور لڑکے کی ماں کو بتایا کہ لڑکا کہاں ہے۔ اُن کی منت کی کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔"

اپنا چہرہ میرے سینے سے مَلنے لگی

اُس نے وجہ تو بیان کر دی لیکن مجھے یقین نہ آیا۔ بے شک یہ عورت جذباتی تھی اور اُس وقت اُس پر جذبات کا غلبہ تھا لیکن میں نے یقین نہ کیا کہ صرف اسی وجہ سے جو اُس نے بیان کی ہے، اُس نے لڑکے کی

نشانہ ہی کر دی تھی۔

"نہیں جوگن!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "تم نے میری ہمدردی اور میری محبت کی قدر نہیں کی۔ وجہ کچھ اور تھی" ـــــ میں نے اپنا داؤ کھیلتے ہوئے کہا ـــــ "تم نے دیکھا ہے کہ رام سہاتے، شاما، سراج اور مولوی باہر بیٹھے ہوتے ہیں۔ انہوں نے بھی مجھے کچھ بتایا ہے۔ تم نے مولوی اور سراج کے قبضے سے لڑکا چھڑایا ہے۔ یہ تم سے بدلہ لے رہے ہوں گے، اسی لئے اِن دونوں نے مجھے کچھ اور بتایا ہے۔ تم سچی بات بتا دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ سے کوئی بے انصافی ہو جائے۔ تمہاری بیٹی جوان ہے۔ اُسے دیکھنے والا کوئی نہیں ہو گا۔"

"میں نے کوئی جرم تو نہیں کیا!" ـــــ اُس نے کہا۔

"تین چار گواہ کسی کے خلاف ایک ہی بات کہہ دیں تو اُس کا جُرم ثابت ہو جاتا ہے" ـــــ میں نے کہا ـــــ "اُس نے خواہ جُرم نہ ہی کیا ہو .... میں نے تمہیں کہا ہے کہ تمہاری باتوں نے میرے دل پر جو اثر کیا ہے وہ اثر قائم رہنے دو۔"

اس طرح کچھ اور جذباتی اور چکنی چپڑی باتیں کہہ کر میں نے اُسے بولنے پر مجبور کر دیا۔

"آپ ان جاگیرداروں کا ساتھ تو نہیں دیں گے؟" ـــــ اُس نے پوچھا اور میرا جواب سُنے بغیر کہنے لگی ـــــ "سکھ تھانیدار بھی انہی کا دوست تھا۔ میں تو کہا کرتی ہوں کہ قانون بھی انہی کا ہے اور پولیس بھی انہی کی ہے۔"

"مجھے سچی بات نہیں بتاؤ گی تو میں تمہارا کیسے بنوں گا؟" ـــــ میں نے کہا ـــــ "تم سچی بات دل میں چھپاتے رکھو اور تمہارے دشمن جھوٹ بول کر تمہیں پھنسا دیں گے۔"

"میں خالد میاں کا کیا بگاڑ سکتی تھی" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "اُس کا ایک کام بگاڑ کر دل خوش کر لیا۔ اُس سے انتقام لینے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ وہ لڑکے کو اغوا کر کے جو مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا وہ میں نے پورا نہ ہونے دیا۔"

"اپنے مالک کے ساتھ تمہاری کیا دشمنی تھی؟"

"میری بیٹی کو اپنے پاس بلاتا تھا" ـــــ جوگن نے کہا ـــــ "اور میں اُسے نہیں جانے دیتی تھی۔ خالد نے مجھے بہت انعام دیئے، دھمکیاں بھی دیں، یہ بھی کہا کہ وہ میری بیٹی کو اغوا کرا دے گا۔ شامے کو بھی اُس نے میرے پیچھے ڈالا۔ میں خالد میاں کے آگے کتنی بار روئی اور اُس کی منت بھی کی کہ میری بیٹی کو اپنی بہن سمجھے لیکن صاحب! جو شیطان کی نسل سے ہوتے ہیں وہ انسانوں کی عزت کا خیال نہیں کیا کرتے۔ میں نے کہا کہ میں اُس کی جاگیر سے نکل جاتی ہوں۔ اُس نے کہا کہ نکل کے تو دیکھو۔ تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی اور لڑکی میرے قبضے میں ہو گی....

"میں نے لڑکی کا رشتہ ساتھ والے گاؤں میں دے دیا۔ اگر دن مقرر کر کے شادی جلدی کر دیتی تو میں سکھی رہتی۔ اتنے میں خالد میاں آگیا۔ اسے پتہ چلا تو کہنے لگا کہ لڑکی کی شادی نہیں ہو گی۔ دو ہی دنوں بعد لڑکے والوں کا پیغام آیا کہ انہیں میری بیٹی منظور نہیں۔ میں اُن کے گھر گئی تو انہوں نے بتایا کہ رام سہاتے اور شامے نے انہیں کہا ہے کہ لڑکی کنواری نہیں اور اُس کا چال چلن بہت بُرا ہے۔ میں رام سہاتے اور شامے کے گلے پڑی۔ دونوں نے صاف صاف کہا کہ خالد میاں کو راضی کرو۔ خالد میاں کے آگے روتی پیٹی تو اُس نے ظالم بادشاہوں کی طرح کہا کہ یہاں کسی کی بارات نہیں آتے گی اور تمہاری بیٹی کی ڈولی یہاں سے نہیں جاتے گی۔"

میں نے خالد کو بُرا بھلا کہا اور یہ بھی کہا کہ دیکھنا میں ان دونوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں۔ میری کچھ باتیں بناوٹی تھیں لیکن اپنے کردار اور اپنے جذبات کے زیرِ اثر میری ہمدردی میں خلوص تھا جس کا میں اظہار کرتا رہا۔ اس کا جوگن پر اثر ہوا اور اُس کے آنسو نکل آتے۔ میں نے اپنی باتوں سے اُسے اور زیادہ جذباتی کر دیا۔

خالد نے جوگن پر صرف یہی ظلم نہ کیا کہ اُس کی بیٹی کی شادی کے راستے بند کر دیئے بلکہ جوگن سے کہا کہ وہ اُس کا ماہوار وظیفہ لگا دے گا اور وہ

اپنی بیٹی کو اُس کی داشتہ بنا دے۔ وہ جتنے دن یہاں رہا کرے گا، جوگن کی بیٹی اُس کے ساتھ رہا کرے گی۔

جوگن نے مجھے سنایا کہ انہی دنوں خالد کی نظر نُورروز پر پڑ گئی تو اُس کی توجہ اُس کی طرف ہو گئی، لیکن اس سے جوگن کو اطمینان نہ ہُوا۔ خالد اپنا فرعونوں جیسا فیصلہ سنا چکا تھا۔ نُورروز اُس کے پاس آتی رہی پھر بھی وہ کبھی کبھی جوگن سے اُس کی بیٹی کا مطالبہ کرتا تھا اور جوگن کسی نہ کسی بہانے اُسے ٹال دیتی تھی۔ جوگن کو شک ہو گیا تھا کہ نُورروز باوقار خاندان کی لڑکی ہے اس لئے وہ خالد کے ہاتھ نہیں آ رہی۔ اتنے میں نُورروز کا بھائی اغوا ہو گیا۔

اپنے بیان کے اس مرحلے پر آ کر جوگن چُپ ہو گئی۔ کچھ دیر میرے مُنہ کی طرف دیکھتی رہی۔

"اب دشمنی بتا دوں؟" — اُس نے مجھ سے پوچھا — "آپ میرے سر پہ ہاتھ رکھ لیں گے؟"

بغیر سوچے سمجھے میرا ہاتھ اُٹھا اور اُس کے سر پر چلا گیا۔ میرے مُنہ سے یہ الفاظ نکل گئے کہ تم سچ بولو اور یہ ہاتھ اس سر پر رہے گا۔ میری یہ حرکت غیر دانستہ طور پر سرزد ہو گئی تھی۔ یہ میرے کردار کے عین مطابق تھا۔

"یہ جو زہر سے مارا گیا ہے" — جوگن نے دانت پیس کر کہا — "اللہ اُس کے سارے خاندان کو زہر سے مارے۔ اُس نے میری بیٹی کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ یہ تو اللہ نے اُس کی عزت بچانی تھی کہ میں پہنچ گئی اور بیٹی کو چھڑا لائی۔ اگلی صبح اُس نے مجھے بلایا۔ اُس نے مجھے مارا پیٹا تو نہیں لیکن میرا گریبان پکڑ کر زور زور سے جھنجھوڑا اور کہنے لگا کہ میں تمہیں زیادہ مہلت نہیں دوں گا۔ تمہاری بیٹی میری داشتہ ہے۔ اسے خود لا کر تم میرے حوالے کرو گی۔"

اُس نے یہ بیان ایسے انداز سے دیا کہ غصے سے میرا چہرہ بھی سُرخ ہو گیا اور کچھ ایسی باتیں مُنہ سے نکل گئیں جن کا اُس پر بہت اثر ہُوا۔

"اُس کی اس حرکت کے بعد میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ لڑکے کی ماں کو بتا

دوں گی کہ وہ کہاں ہے" — اُس نے کہا — "میں نے یہ کام کر دیا۔"

"جوگن!" — میں نے ہاتھ بڑھا کر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اُس کے گال کو تھپکی دے کر کہا — "تم نے مردوں والا کام کیا ہے۔ اگر تم یہ کہہ دو کہ تم نے اس بدبخت کے گلے پر چھری پھیری تھی تو میں تمہیں صاف بچا لوں گا۔"

"چھری پھیرنے کی ہمت ہوتی تو زہر کیوں ....." اتنا کہہ کر وہ یُوں چُپ ہو گئی جیسے اُس کی زبان اچانک بولنے سے معذور ہو گئی ہو۔ اُس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ اُس کے ہونٹ کانپے لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکی۔

"جوگن!" — میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اور دوسرا ہاتھ اُس کے سر پہ رکھ کر کہا — "چپ کیوں ہو گئی ہو؟ بولو۔ یہاں اور کوئی نہیں۔ صرف میں سُن رہا ہوں۔"

اُس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ مُنہ ذرا سا کھُلا ہُوا تھا۔ مجھے اپنا راز مل گیا تھا۔ خالد کو زہر اسی نے دیا تھا۔ میں اُس سے پورا بیان لینا چاہتا تھا۔ میں اُٹھا۔ اسے اٹھایا اور بے ساختہ اپنی طرف کھینچ کر اُسے گلے لگا لیا۔ میرے گلے لگنے کی دیر تھی کہ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے اور اپنا چہرہ میرے سینے سے ملنے لگی۔ میں نے اُسے رونے دیا اور اُس کے سر اور پیٹھ پر تھپکیاں دیتا رہا۔

پانچ سات منٹ بعد وہ مجھ سے ہٹ کر کرُسی پر بیٹھ گئی۔ اُس نے آنسو پونچھے۔ میری طرف دیکھا۔

"میری بیٹی کا کیا بنے گا؟" — اُس نے کہا۔

"تم بات کرو" — میں نے کہا — "تم نے جو کچھ کیا ہے اپنی بیٹی کی عزت کی خاطر کیا ہے اور تم نے ایک بیوہ ماں کو اُس کا بچہ اور ایک بہن کو اُس کا بھائی زندہ اور سلامت واپس دیا ہے۔ تمہیں اس کا صلہ اللہ دے گا۔"

ضمیر اور زہر

اُس نے بیان دے دیا۔ جب نُوروز کا بھائی خالد کے ہاتھ سے نکل گیا تو نُوروز بھی اُس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ خالد کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ لیکن وہ اپنے ملازموں وغیرہ کے لئے مصیبت بن گیا۔ وہ کہتا تھا کہ معلوم کرو یہ نشاندہی کس نے کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے جوگن کو حکم دے دیا کہ بیٹی میرے حوالے کرو۔

"اگر تم میرے بھائی بنتے ہو تو پھر ایک بات اور سُن لو" ۔۔۔ جوگن پر اب کچھ اور ہی کیفیت طاری ہو چکی تھی جس میں اُس نے مجھے آپ کی بجائے تم کہا۔ کہنے لگی ۔۔۔ "میں نے سات آٹھ سال گزرے اپنے خاوند کو جو زہر دیا تھا وہ میرے گھر میں ابھی تک کچھ باقی رکھا تھا۔ خدا کی قسم میرے بھائی، میں نے یہ اپنے لئے رکھا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ میری بچی جوان ہو گی۔ اگر جوان ہو کر یہ غلط راستے پر چل پڑی یا چلائی گئی تو یہ زہر اسے بھی پلاؤں گی اور خود بھی پی لوں گی۔۔۔۔

"میں یہ زہر لے کر رات خالد کے ہاں چلی گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ اگلے روز اُس نے واپس شہر جانا تھا۔ اسی لئے اُس نے بڑا سخت حکم دیا تھا کہ اپنی بیٹی کو آج رات لے آؤ۔ میں اکیلی گئی تو وہ شراب کا گلاس سامنے رکھے بیٹھا تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ بیٹی کہاں ہے۔ جس کام نے ہونا تھا اُس کا سبب اپنے آپ بن گیا۔ میں نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ اُسے زہر کس طرح دوں گی۔ دیکھا کہ اُس کے سامنے گلاس رکھا ہے جس میں شراب ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ بیٹی ساتھ آئی ہے لیکن شرم کے مارے باہر رُک گئی ہے۔ آپ خود جا کر اُسے لے آئیں۔

"وہ بڑی تیزی سے اُٹھا اور باہر گیا۔ میں نے پُڑیا کھولی اور ایک چٹکی شراب میں ڈال دی۔ اتنی ہی کافی تھی۔ وہ واپس آیا تو کہنے لگا کہ وہ باہر نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ وہ شرم کے مارے گھر بھاگ گئی ہو گی۔ میں نے اُسے بٹھا لیا اور کہا کہ میں نے فیصلہ کر دیا ہے کہ میری بیٹی اب آپ کی ہے۔ آپ چاہیں اُس کے ساتھ شادی کریں، چاہیں تو بے نکاحی رکھ لیں لیکن یہ بتا دیں کہ مجھے

آپ کتنا وظیفہ ماہوار دیں گے۔ اُس نے جو رقم بتائی میں نے کہا کہ منظور ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کچھ باتیں شروع کر دیں اور وہ شراب گھونٹ گھونٹ پیتا ساری پی گیا۔ زہر کا اثر اُسی وقت نہیں ہونا تھا۔ میرے لئے مشکل یہ تھی کہ اسے آج رات کیسے ٹالا جائے۔۔۔۔

"میں نے نُوروز کی بات چھیڑ دی اور کہا کہ وہ اُس سے بہت ڈری ہوئی ہے اور میں اُسے اور زیادہ ڈرا رہی ہوں اور مجھے امید ہے کہ وہ اُس کے جال میں پھنس جائے گی۔ اُس نے نُوروز کے منگیتر وغیرہ کو گالی گلوچ کی۔ میں مردوں کو نچانا جانتی ہوں۔ وہ کمال میں نے دکھا دیا اور اُسے کہا کہ وہ اگر کل شہر جا رہا ہے تو چلا جائے واپس آئے گا تو میری بیٹی اُس کے گھر میں موجود ہو گی۔ میں نے زبان کے بہت کرتب دکھائے۔ وہ نشے میں تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے اُس کے گلاس میں اور شراب ڈال دی۔ باتوں باتوں میں وہ پیتا رہا۔ پھر بدمستی میں بہکنے لگا۔ میں نے اُسے پلنگ پر لٹا دیا اور اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔۔۔۔ دس بارہ روز بعد میرے کان میں یہ آواز پڑی کہ اُس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی ہیں۔۔۔۔ وہ اگلے روز شہر چلا گیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا"۔

"اپنے خاوند کو کیوں زہر دیا تھا؟"

"بدکار تھا" ۔۔۔ جوگن نے جواب دیا ۔۔۔ "بے غیرت تھا چرس پیتا تھا۔ اُسے اپنی جوان بیوی کی عزت کا بھی خیال نہیں تھا۔ گھر کے پیسے شہر میں جا کر اُڑا آتا تھا۔ مجھے بے عزت اور بے غیرت اُسی نے بنایا تھا۔ میں اُسے روکتی تھی اور وہ مجھے مارتا پیٹتا تھا۔ میری بچی جب گیارہ بارہ سال کی ہوئی تو میری غیرت جاگی کہ جوان ہو کر یہ بھی بے عزت ہو جائے گی۔ ایک سادھو سے مجھے یہ زہر مل گیا جو میں نے خاوند کو پلا دیا"۔

اگر میں ہر ایک بات اور تفصیل لکھنے لگوں تو یہ کہانی بہت ہی لمبی ہو جائے گی۔ قاتل میرے سامنے آ گیا تھا لیکن میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اس عورت کو سزا نہیں ہونے دوں گا۔ مقدمہ تو مجھے پورا بنانا تھا۔ میں یہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ مقدمے میں ایسی بھول رکھ دیتا جس سے میری نالائقی ثابت

ہوتی۔ میں نے جوگن کو مجسٹریٹ کے سامنے اقبالی بیان دینے کے لئے تیار کر لیا۔ وہ صرف اپنی بیٹی کے لئے روتی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ اُس کی بیٹی کا میں پکا انتظام کروں گا۔

اس کے بعد میری جتنی کارروائی تھی وہ شہادت کی فراہمی اور مقدمے کی تیاری تھی۔ لڑکے کے اغوا کا کیس میں نہیں بنا سکتا تھا کیونکہ اُس کی کوئی رپورٹ نہیں تھی لیکن میں نے سب انسپکٹر جوگندر سنگھ کے خلاف بڑی سخت رپورٹ لکھی اور لڑکے کے اغوا کا واقعہ مکمل لکھا۔ یہ میں آپ کو پہلے ہی بتا دوں کہ جوگندر سنگھ کو معطل کر کے لائن حاضر کر دیا گیا تھا۔ نوروز کے منگیتر اور اُس کے باپ نے آئی۔ جی تک رسائی حاصل کر لی تھی اور اُن کی درخواست پر تحقیقات ہو رہی تھی۔ ادھر میری رپورٹ بھی تحقیقات میں شامل ہو گئی تو جوگندر سنگھ کو سروس سے ہی برطرف کر دیا گیا۔

میں نے جوگن کو تو حراست میں لینا ہی تھا۔ اُس کی بیٹی کا یہ انتظام کیا کہ شامے، سراج اور مولوی کو بلا کر بہت ذلیل کیا اور کہا کہ وہ جوگن کی بیٹی کو اپنی تحویل میں اپنی بیٹیوں کی طرح رکھیں۔ اگر ذرا سی بھی اونچ نیچ ہوتی تو میں ان سب کو لڑکے کے اغوا میں گرفتار کر کے سات سات سال سزا دلاؤں گا۔

جوگن بے چاری اتنا قابل وکیل کیسے کر سکتی تھی جو اُسے بری کرا لیتا۔ میں نے اس کا یہ انتظام کیا کہ جب میں نے نوروز کے منگیتر، منگیتر کے بھائی اور اُن کے باپ کے بیان لئے تو انہیں کہا کہ جس عورت نے اُن کا بچہ قتل سے بچایا اور قید سے نکلوایا تھا وہ خالدہ کے قتل میں پکڑی گئی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اُسے سزا ہو۔ وہ روپے پیسے والے لوگ تھے۔ انہوں نے کہا کہ اُس عورت کے لئے تو وہ بہت بڑی قربانی دینے کے لئے بھی تیار ہیں۔ انہوں نے اپنی جیب سے ایک بڑا قابل عیسائی وکیل کیا۔

پہلی پیشی پر جب ہم گئے تو میں نے موقع نکال کر اس وکیل کے کان میں دو نکتے ڈال دیئے اور اسے کہا کہ سیشن سے جوگن کو بری کراتے اور

سیشن سے سزا ہو بھی گئی تو ہائی کورٹ اپیل میں شک کا فائدہ یقیناً دے گی۔

آخر ہُوا یہ کہ شک کا فائدہ سیشن کورٹ نے ہی دے دیا اور جوگن بری ہو گئی۔

قاضی کی کوٹھڑی اور کنواری بیٹی

میں اسے معمولی سا کیس سمجھا تھا لیکن بات کا بتنگڑ بن گیا۔

وہ سرحد کے اُس طرف کا ایک قصبہ تھا جو دوسری جنگِ عظیم کے دوران اچھا خاصا شہر بن گیا تھا۔ تقریباً ایک چوتھائی آبادی مسلمانوں کی تھی۔ مسلمان مزدور پیشہ بھی تھے، درمیانہ طبقے کے پڑھے لکھے بھی اور ان کی اچھی خاصی تعداد متموّل اور امیر بھی۔ اِن کے محلے الگ تھے۔ شہر کا ایک ہی تھانہ تھا جس میں ارد گرد کے کچھ گاؤں بھی شامل تھے۔

ایک صبح میں تھانے پہنچا تو پتہ چلا کہ ایک کیس آیا ہُوا ہے۔ میں نے ان لوگوں کو اپنے دفتر میں بلایا۔ اِن میں ایک نوجوان لڑکا تھا جس کی عمر سولہ سترہ سال تھی۔ اگر یہ نوجوان برقعے میں ہوتا تو کسی کو شک نہ ہوتا کہ یہ لڑکا ہے۔ برقعے کے بغیر بھی اُس کا چہرہ لڑکیوں جیسا تھا۔ اُس زمانے میں لڑکیوں خصوصاً مسلمان لڑکیوں کے بھی قد چھ فٹ سے دو اڑھائی انچ ہی کم ہوتے تھے۔ آج کل اس قد کا کوئی آدمی بھی نظر نہیں آتا۔ یہ نوجوان بہت خوبصورت تھا۔ وہ دُبلا پتلا نہیں تھا۔ بڑے موزوں جسم کا نوجوان تھا۔ اُس کا نام اختر بتایا گیا۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ ماں اُسے اختری کہتی ہے۔ اُس کا رنگ گورا تھا اور سر پر تُرکی ٹوپی تھی۔ اُس زمانے میں شہروں میں بیشتر مسلمان کالے پھُندنے والی لال رنگ کی ٹوپی پہنتے تھے جسے تُرکی ٹوپی کہا جاتا تھا۔ سر ننگا رکھنے کا رواج نہیں تھا۔ بڑوں کے سامنے ننگے سر بیٹھنے کو آداب کے خلاف بلکہ اسے بدتمیزی سمجھا جاتا تھا۔

ماں اختر کے ساتھ تھی اور محلّے کے دو اور معزز آدمی بھی ان کے ساتھ آتے تھے۔ واردات جو انہوں نے بتائی وہ یوں تھی کہ اختر ہی دوسری تیسری رات اپنے ایک دوست کے گھر جایا کرتا تھا۔ اُس نے چند ہی دن پہلے میٹرک پاس کیا تھا۔ اب فارغ تھا۔ وہ گذشتہ رات نو بجے کے لگ بھگ اپنے دوست کے گھر سے آرہا تھا۔ ایک گلی میں ایک پرانا اور غیر آباد مکان تھا۔ یہ کھنڈر بنتا جارہا تھا۔ اختر اس مکان کے سامنے سے گزر آیا تو پیچھے سے اُسے سَر پر کسی نے لاٹھی ماری یا موٹا ڈنڈا۔ اختر چکرا گیا۔ اُس کی آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ اختر کا دماغ سُن ہو گیا۔ اتنا بھی نہ سوچ سکا کہ پیچھے مڑ کر دیکھتا کہ اُسے ڈنڈا مارنے والا کون ہے۔

سَر کے پچھلے حصّے پر ضرب پڑے تو آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اختر کو یہاں تک یاد تھا کہ اُسے کسی نے وزنی لاٹھی یا ڈنڈا مارا تھا اور اس کے فوراً بعد اُس کی پیٹھ کے بالائی حصّے پر دو ضربیں اور پڑی تھیں۔ پھر اُسے ہوش نہ رہا۔ ہوش ٹھکانے آئے تو اُسے چارپائی پر ڈال کر ہسپتال لے جارہے تھے۔

اُسے حملہ آور کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ اُس کی جیب میں کوئی رقم نہیں تھی۔ گھڑی نہیں تھی۔ سونے کی انگوٹھی نہیں تھی۔ اُس کے پاس کوئی ایسی قیمتی چیز نہیں تھی جو لوٹنے کے لئے اُس پر حملہ کیا گیا ہو، یعنی یہ رہزنی کی واردات نہیں تھی۔ وہ قصبہ تھا اور موسم سردیوں کا تھا۔ رات نو بجے تک لوگ سو جایا کرتے تھے اور گلیاں سنسان ہو جایا کرتی تھیں۔

لڑکے کی عمر اور خوبصورتی دیکھ کر میرے ذہن میں کچھ شکوک آئے۔ آپ نے آج کل اخباروں میں ایسی خبریں پڑھی ہوں گی کہ ایک لڑکے نے ایک دوست کو چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ دوستی کر لی تو پہلے دوست نے لڑکے کو چاقو گھونپ دیا۔ مجھے یہ واردات اسی قسم کی معلوم ہونے لگی۔ میں نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ یہ کیس درج رجسٹر کرنے والا نہیں۔ اگر لڑکے کو کوئی قتل کرنا چاہتا تو تیز دھار آلہ استعمال کر سکتا تھا، لیکن میں ان لوگوں کو ٹالنا نہیں چاہتا تھا۔ میں شاید انہیں کچھ سمجھا بجھا کر رخصت کر دیتا لیکن یہاں ماں کا معاملہ

تھا اور یہ بڑا جذباتی معاملہ تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ اختر ماں کا اکلوتا بیٹا ہے اور اس کا باپ تین ساڑھے تین سال پہلے فوت ہو چکا تھا۔ ماں کا سہارا یہی ایک لڑکا تھا جسے دیکھ کر ماں زندہ تھی۔ اختر کا باپ ضلعی شہر میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں کسی بڑی اچھی پوسٹ پر تھا۔ اُس کا گزارہ صرف تنخواہ پر نہیں تھا۔ اُس کی بہت بڑی حویلی کے علاوہ قصبے میں دو اور مکان تھے جو کرائے پر دیتے ہوتے تھے اور قصبے کے ساتھ زیرِ کاشت اراضی خاصی تھی۔ اس لحاظ سے یہ کُنبہ امیر تھا۔

اختر کی ماں کی خوبصورتی بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ چہرے سے وہ تیس سال سے کم لگتی تھی لیکن چالیس سے اوپر کی تھی۔ جسم کی ساخت اور چال میں جوانی کے پہلے دَور والی کشش ابھی موجود تھی۔ وہ روتی اور مجھے کہتی تھی کہ آج اُس کے بیٹے پر جو حملہ ہُوا ہے یہ کل پرسوں قاتلانہ حملہ بھی بن سکتا ہے، میرا بچہ قتل بھی ہو سکتا ہے۔

میں نے اُسے تسلّی دی اور کہا کہ میں تفتیش میں کوتاہی نہیں کروں گا۔ مجھے صرف یہ بتا دیں کہ دشمنی کس کے ساتھ ہے۔ ماں نے کہا کہ وہ دشمن بنانے والی عورت نہیں۔

"....اور میرے اختر کا باپ صرف دوست بنانا جانتا تھا" —— اُس نے کہا۔

اُس کے ساتھ آئے ہوئے دونوں آدمیوں نے اُس کی تائید کی۔ مجھے ہندوؤں پر بھی شک تھا۔ ہندو مسلم کشیدگی تو رہتی ہی تھی لیکن ابھی ایک دوسرے پر قاتلانہ حملے شروع نہیں ہوتے تھے۔ اگر ہوتے بھی تھے تو صرف اس لڑکے پر حملہ کر کے ہندو کیا حاصل کر سکتے تھے؛ میرے ذہن میں بار بار یہی شک آتا تھا کہ یہ لڑکے کی ذاتی دشمنی کا مظاہرہ ہے۔ میں نے اُسے الگ کر لیا اور باقی سب کو باہر بٹھا دیا۔

میں نے سب سے پہلے اُس کی چوٹیں دیکھیں۔ سَر پر موٹا ڈنڈا یا لاٹھی زور سے پڑے تو جلد پھٹ جاتی ہے اور خون نکلتا ہے۔ اختر کے سَر پر ترکی ٹوپی تھی اسی لئے ضرب زخم نہ کر سکی۔ میں نے دیکھا، اُس کے سَر پر اُبھار تھا۔ اُس کی

قمیض اُٹھوا کر پیٹھ دیکھی۔ وہاں چوٹوں کے دو لمبے لمبے نشان بڑے صاف تھے مجھے ان ضربوں کی تحریری رپورٹ ڈاکٹر سے لینی تھی۔ مجھے بتایا جا چکا تھا کہ ڈاکٹر نے دوائی وغیرہ دے کر لڑکے کو اُسی وقت فارغ کر دیا تھا۔ وہ سول ہسپتال کا سرکاری ڈاکٹر تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اُس نے ضربوں کی تفصیل لکھ لی ہو گی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ پولیس کیس ہے۔ میں نے محرر ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ ڈاکٹر سے رپورٹ لے آئے۔

ایک لڑکی رقعے بھیجتی ہے

میں نے اختر کے متعلق جو رائے قائم کی تھی وہ اُس کا انداز دیکھ کر پھر باتیں سُن کر بدلنے لگی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ذہنی طور پر بالغ نہیں ہو گا اور وہ مجھ سے جھینپے اور شرمائے گا۔ اُسے ڈرا ہُوا ہونا چاہیئے تھا۔ اُس پر بے خبری میں حملہ ہُوا تھا اور حملہ آور کو وہ نہیں جانتا تھا لیکن وہ تو ذرا سا بھی گھبرایا ہُوا نہیں تھا۔

"امّی آپ کو بلاوجہ پریشان کر رہی ہیں" — اختر نے میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی کہا — "میں نے انہیں بہت کہا کہ تھانے نہ چلو"۔

"پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں معلوم ہے تم پر حملہ کس نے کیا ہے" — میں نے کہا — "اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ حملے کی وجہ کیا ہے!"

"ابھی معلوم نہیں" — اُس نے پختہ کار آدمیوں جیسی خود اعتمادی سے کہا — "معلوم ہو گیا تو جو مجھ پر وار ہُوا ہے اس سے زیادہ بُرا انتقام لوں گا"۔

"تمہیں کسی پر شک تو ہو گا" — میں نے کہا — "مجھے ذرا سا اشارہ دے دو۔ تم نے کسی کے ساتھ دوستی توڑی ہو گی، کسی کے ساتھ لگائی ہو گی"۔

"میری دوستی اتنی کچی نہیں ہوتی" — اُس نے کہا — "ابھی تک تو کسی سے میری دوستی ٹوٹی نہیں" — اُس نے پختہ سے لہجے میں کہا — "دوستی لگا کر توڑنا مَردوں کا کام تو نہیں"۔

مجھے یقین ہو گیا کہ لڑکا کچا نہیں۔ مجھے اس میں ذہنی بلوغت نظر آگئی۔ وہ کھل کر بات کرتا تھا۔

"میرا یہ سوال غور سے سنو!" — میں نے کہا — "کبھی کسی شیطان یعنی کسی بدچلن اور بدمعاش سے لڑکے نے تمہیں دوست بنانے کی کوشش کی ہے؟ لڑکے نے یا بڑی عمر کے کسی آدمی نے؟ .... اور تم نے دوستی کو قبول نہیں کیا ہو گا!"

"میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں" — اُس نے بلاجھجک کہا — "مجھے سب جانتے ہیں میرے ساتھ کوئی لڑکا یا کوئی آدمی اس طرح کی دوستی لگانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا تو ایک لڑکے نے مجھے بُری نیّت سے چھیڑا تھا۔ اِسی شہر کا رہنے والا ہے۔ آج بھی مجھے دیکھتا ہے تو راستے سے ایک طرف ہو جاتا ہے"۔

"یہ تو پرانی بات ہے" — میں نے کہا — "ایسا کوئی نیا واقعہ!"

"ایسا کوئی اور واقعہ نہیں ہُوا" — اُس نے کہا — "ویسے بھی میں بدچلن اور بدمعاش لوگوں کے ساتھ دوستی نہیں لگایا کرتا .... وجہ یہ ہے جی، میں نے اپنے والد صاحب کے نیک اور باعزّت نام کو زندہ رکھنا ہے۔ ہر کوئی اُن کی عزّت کرتا تھا۔ مجھے اپنی امّی کا بہت خیال رہتا ہے۔ میں کہتا ہوں کوئی میری امّی سے یہ نہ کہہ سکے کہ تمہارا بیٹا بدچلن لڑکوں کا دوست ہے"۔

"اِس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تم شریف لڑکے ہو" — میں نے کہا۔

"معلوم نہیں شریف سے آپ کا مطلب کیا ہے" — اُس نے کہا — "میں اُس قسم کا شریف لڑکا نہیں ہوں کہ کوئی مجھے للکارے تو میں کان لپیٹ کر چُپ رہوں۔ میں کسی کا رُعب برداشت نہیں کیا کرتا"۔

میں نے جب دیکھا کہ اس لڑکے میں اپنی عمر سے کچھ زیادہ پختگی ہے تو میں نے اُس کے ساتھ صاف بات کی۔

"دیکھو اختر!" — میں نے کہا — "تم بُرے لڑکے ہو، اچھے لڑکے ہو، اس کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں اُس آدمی کا سراغ لگانے کی کوشش

کر رہا ہوں جس نے تم پر حملہ کیا ہے. تم بڑے خوبصورت لڑکے ہو اور نوعمر ہو۔ بعض آدمیوں کی نیت بڑی بُری ہوتی ہے"۔

"میں آپ کا مطلب پہلے ہی سمجھ چکا ہوں"— اُس نے کہا —" اور میں آپ کا یہ شک رفع بھی کر چکا ہوں"۔

"پھر کسی لڑکی کے ساتھ تمہارا دوستانہ ہوگا"— میں نے کہا —" اُس کے کسی بھائی نے تم پر وار کیا ہوگا"۔

"اگر کوئی لڑکی رات کے نو بجے کسی آدمی پر لاٹھی یا ڈنڈے سے حملہ کر سکتی ہے تو میں تین لڑکیوں کے نام بتا سکتا ہوں"— اُس نے کہا —"لیکن میں یہ نہیں مانوں گا۔ دو لڑکیاں پردہ دار گھروں کی ہیں اور ایک ہندوؤں کی لڑکی ہے۔ تینوں کی شادی نہیں ہوئی۔ دونوں مسلمان لڑکیاں میری امّی کے پاس آتی ہیں لیکن وہ دراصل میرے لئے آتی ہیں۔ ایک تو رقعے بھیجتی ہے۔ ہندو لڑکی راستے میں آجاتی ہے۔ کئی بار ایسے ہُوا کہ امّی گھر نہیں ہیں اور مسلمان لڑکیوں میں سے کوئی ایک آگئی۔ میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں نے اپنے دل کو قابو میں رکھا"۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی اختر!"— میں نے ہنستے ہوئے کہا —"تم تو مُردہ دل نکلے"۔

"اس معاملے میں مَیں بالکل مُردہ دل ہوں"— اُس نے کہا —"میری زندہ دلی میرے دوستوں سے سُنیں۔ میں شیطان نہیں ہوں شرارتی ہوں۔ اُچھل کُود اور ہنسی مذاق بہت کرتا ہوں"۔

وہ کیسا لڑکا تھا؟ یہ مجھے دوسروں سے پوچھنا تھا۔ اپنے چال چلن کی رپورٹ ہر کوئی اچھی ہی دیا کرتا ہے۔ مجھے سب سے پہلے تو یہ معلوم کرنا تھا کہ اس لڑکے کی یا اس کی ماں کی کس کے ساتھ دشمنی ہے۔ میں نے لڑکے کو اور زیادہ کریدا تو اُسے کچھ یاد آگیا۔

"ایک بات یاد آگئی ہے"— اُس نے کہا —"جس گلی میں کسی نے مجھے مارا ہے، اُس گلی میں ایک غیر آباد مکان ہے۔ اس کے متعلق آپ کو پہلے بھی بتایا گیا ہے۔ اس کے اندر جاؤ تو ڈر آتا ہے۔ دو کمروں کی چھتیں گری ہوئی ہیں۔ پانچ چھ مہینے گزرے دن کے وقت، میں اس مکان کے سامنے سے گزرا تو ایک کنکر سا پیچھے سے آکر میرے آگے گرا۔ یہ میرے سر کے اُوپر سے آگے گرا تھا۔ میں نے اٹھا کر دیکھا۔ یہ کانچ کی گولی تھی۔ اس پر ایک کاغذ لپٹا ہُوا تھا۔ میں نے کاغذ کھولا تو کانچ کی گولی نکلی اور اس کے ساتھ دو انچ سے ذرا زیادہ لمبا اور اتنا ہی چوڑا کاغذ نکلا۔ اس کی تہیں کر کر کے بہت چھوٹا کیا ہُوا تھا....

"میں نے اسے کھولا۔ میں سمجھا کسی لڑکی نے رقعہ پھینکا ہے لیکن یہ تعویذ تھا۔ اس پر خانے بنے ہوتے تھے اور ہر خانے میں ہندسے اور حروف لکھے ہوتے تھے۔ میرے پیچھے کوئی بھی نہیں آرہا تھا۔ میں ویران مکان کے اندر نہ گیا۔ مجھے ڈر سا لگا۔ میرے سامنے کوئی آدمی آکر مجھے للکارے تو میں اُس سے نہیں ڈرتا، یہ تعویذ تھا جو میرے سر کے اوپر سے آگے پھینکا گیا تھا۔ میں نے تعویذ گھر لے جاکر اپنی امّی کو دکھایا تو وہ بہت پریشان ہوئیں۔ اُنہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں اس کے اُوپر سے تو نہیں گزرا تھا؟ میں نے انہیں بتایا کہ میں رُک گیا تھا تو امّی نے اطمینان کا سانس لیا....

"ایک مہینے بعد اسی جگہ سے گزرتے ایک بار پھر ایسا ہی تعویذ میرے سر کے اوپر سے گزر کر میرے آگے گرا۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ اس میں اب کانچ کی گولی کی بجائے کنکری تھی اور پہلے تعویذ جیسا تعویذ تھا۔ میں نے یہ بھی امّی کو دکھایا اور اُنہیں بتایا کہ میں اس کے اوپر سے نہیں گزرا تھا۔ امّی نے پہلا تعویذ لے کر ساتھ والے برساتی نالے کے پانی میں پھینک دیا تھا۔ یہ بھی امّی وہیں پھینک آئیں"۔

قاضی کی بیٹی

اس قسم کے تعویذ آج بھی چلتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایسا تعویذ کوئی کوئی لکھ سکتا ہے۔ اس کی کرامت یہ بتائی جاتی ہے کہ کسی کے دل پر قبضہ کرنا ہو تو یہ

تعویذ اُس کے سر کے اوپر سے پھینکو اور وہ اس کے اوپر سے گزر جاتے، پھر وہ آدمی یا عورت کچی ہوتی آجاتی ہے۔ اختر پر یہی تعویذ پھینکا گیا تھا۔ اس سے میں یہ سمجھا کہ اس لڑکے کے دل پر کوئی قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ کوئی آدمی بھی ہو سکتا تھا اور کوئی عورت بھی۔

یہ میں آپ کو بتا دوں کہ ایسے تعویذوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اختر پر حملہ بھی اسی جگہ ہوا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اختر کی ماں سے یہ باتیں پوچھوں۔

"آپ کا بچہ تو کچھ نہیں بتاتا کہ اس کا دشمن کون ہے؟" — میں نے اختر کی ماں سے پوچھا — "آپ کچھ بتا سکتی ہیں؟"

"میں کچھ نہیں سمجھ سکتی" — اُس نے غم اور ڈر سے دبی ہوئی آواز میں کہا — "میں اتنا ہی جانتی ہوں کہ میرا بچہ دشمنوں کی نظر میں آیا ہوا ہے۔"

"اس نے مجھے دو تعویذوں کے متعلق بتایا ہے" — میں نے کہا — "آپ نے تعویذ کسی عامل وغیرہ کو نہیں دکھائے؟"

"دکھاتے تھے" — اُس نے جواب دیا اور ایک قریبی گاؤں کا نام لے کر کہنے لگی — "وہاں ایک شاہ جی ہیں۔ وہ تعویذ لکھتے بھی ہیں اور سمجھتے بھی ہیں۔ پہلا تعویذ بھی انہیں دکھایا تھا اور دوسرا بھی۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ یہ بڑے سخت تعویذ ہیں۔ انہیں پانی میں پھینک دو۔ کہتے تھے کہ لڑکا ان کے اوپر سے گزر جاتا تو وہ تمہارے ہاتھ سے نکل جاتا۔ میں نے اُن سے کہا تھا کہ وہ معلوم کریں کہ میرے بیٹے پر تعویذ کون پھینک رہا ہے۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ وہ ایسی باتیں نہیں بتایا کرتے کیونکہ لڑائی جھگڑا ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے دو تعویذ دیئے تھے۔ کہتے تھے کہ اس کے بازو یا گلے میں ڈال دینا پھر یہ ہر شیطانی اور اُلٹے اثر سے محفوظ ہو جائے گا.... میں نے کالے بکرے کا صدقہ بھی دیا تھا۔"

اس خوبصورت عورت کو دیکھا۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے متعلق بہت جذباتی اور پریشان تھی۔ میں نے اُس سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ وہ بھی مجھے کچھ نہ بتا سکی۔ میں نے پوچھا کہ لڑکے کا رشتہ کہیں طے ہو گیا ہے؟ یہ میں نے اس لئے پوچھا تھا کہ رشتے کے سلسلے میں کسی کے ساتھ دشمنی پیدا ہو گئی ہو گی۔

"ابھی تو یہ بچہ ہے" — اُس نے کہا — "اتنی جلدی اس کی شادی نہیں کروں گی۔ رشتوں کے پیغام آتے رہتے ہیں۔ میں نے ابھی تک کسی کو پسند نہیں کیا۔"

اُس دَور میں پیغام لڑکیوں کے رشتے کے لئے جایا کرتے تھے۔ لڑکی والوں نے کسی لڑکے کے رشتے کا پیغام کبھی نہیں بھیجا تھا۔ اسے لڑکی والے اپنی بے عزتی کا باعث سمجھا کرتے تھے۔ پھر بھی بعض لڑکے ایسے ہوتے تھے جنہیں اپنی لڑکیوں کے لئے حاصل کرنے کی لوگ کوشش کرتے تھے۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ ہوتا تھا کہ ایسی لڑکیوں کے ماں باپ اپنی پسند کے لڑکے کے ساتھ اپنے سگے بیٹوں جیسا پیار کرتے تھے اور عیدوں پر اُسے عیدی اور تحفے دیتے تھے۔ دوسرا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ اپنے اعتماد کی ایک دو عورتوں کو استعمال کیا جاتا تھا۔ وہ مطلوبہ لڑکے کی ماں سے کہتی رہتی تھیں کہ فلاں لڑکی کے ماں باپ اس لڑکے کی بہت خواہش کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ عورتیں لڑکی کی بہت تعریفیں کرتی تھیں اور یہ بھی بتاتی تھیں کہ ماں باپ لڑکی کو زیورات اور جہیز کتنا دیں گے، پھر لڑکے کی ماں اور بہنوں کو اُکسایا جاتا تھا کہ وہ لڑکی کا رشتہ مانگنے جائیں۔ دستور آخر یہی ہوتا تھا کہ رشتے کے لئے لڑکے والے جاتے تھے۔

اختر کے معاملے میں یہی ہو رہا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے قیمتی لڑکا تھا۔ نوعمر تھا، خوبصورت تھا اور سب سے بڑی خوبی یہ کہ امیر ماں باپ کا بیٹا اور اکلوتا ہونے کی وجہ سے اتنی زیادہ جائیداد کا اکیلا وارث تھا۔ ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اختر کی ایک بھی بہن نہیں تھی۔ ایک بھی نند کا نہ ہونا لڑکی کے لئے بہت بڑی خوبی تھی۔ اتنی زیادہ خوبیوں والے لڑکے اور گھرانے کو حاصل کرنے کے لئے لڑکیوں والے دوسری عورتوں کی زبانی لڑکیاں پیش کر رہے تھے اور اختر کی ماں نے ابھی کسی کو پسند نہیں کیا تھا۔

لڑکیوں کی مائیں اپنی پسند کے لڑکے کو اپنی لڑکی کے لئے حاصل کرنے کی خاطر پیروں، مزاروں اور عاملوں کا سہارا بھی لیا کرتی تھیں۔ تعویذ جو اختر کے سر کے اوپر سے پھینکے گئے تھے، وہ کسی لڑکی کی ماں نے اختر کو اپنی طرف مائل

کرنے کے لئے کسی "پہنچ والے" بزرگ سے لتے ہوں گے۔ اس مقصد کے لئے بعض تعویذ ایسے بھی ہوتے تھے جو مطلوبہ لڑکے کے گھر کی دیوار میں رکھے جاتے تھے۔

"آپ ذرا اور سوچیں اور یاد کریں" — میں نے اختر کی ماں سے کہا — "آپ نے کسی کو اگر پسند نہیں کیا تھا تو کسی کو ناپسند ضرور کیا ہوگا۔ کسی عورت سے آپ نے کہا ہوگا کہ فلاں گھر تو آپ کو اچھا نہیں لگتا"۔

"ہاں جی!" — اُس نے کہا — "ایسی باتیں تو ہوتی ہی تھیں۔ عورتوں نے اُن لڑکیوں کی ماؤں تک پہنچا دی ہوں گی"۔

مجھے غصہ تو نہ آیا، کوفت سی محسوس ہوتی۔ یہ عورت وہی بات کرتی تھی جو میں پوچھتا تھا۔ میرا خیال ہے اُس پر اپنے بیٹے کی پریشانی اور گھبراہٹ سوار تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ مجھے شک ہے کہ اُس نے اپنے بیٹے کے رشتے کے سلسلے میں کسی کے ساتھ دشمنی پیدا کر لی ہے۔

"کیا کسی لڑکی کے ماں باپ ایسے بھی ہیں جو دھونس اور رُعب جمانے کے عادی ہوں؟" — میں نے پوچھا۔

یہ ہمارے معاشرے کا ایک اور پہلو ہے۔ عام طور پر لڑکے والے یوں کرتے ہیں کہ لڑکی والے رشتہ دینے سے انکار کر دیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی بے عزتی کی گئی ہے جس کا انتقام لینا ضروری ہے۔ وہ لڑکی والوں کے خلاف محاذ بنا لیتے ہیں۔ لڑکی کو بدچلن کہتے ہیں اور رنگ میں بھنگ ڈالنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔

ایسی وارداتیں بھی ہوتی تھیں جو آج کل بھی کہیں کہیں سُننے میں آتی ہیں کہ شادی کا دن مقرر ہُوا اور ایک ہی وقت دو باراتیں پہنچ گئیں۔ ایک اصل اور دوسری بارات اُس لڑکے کی جسے رشتے سے جواب دیا گیا تھا۔ اس صورت میں دنگا فساد ہوتا ہے، پولیس آتی ہے اور نقلی بارات واپس چلی جاتی ہے۔

میں اختر کی ماں سے یہی پوچھ رہا تھا کہ اختر کا رشتہ حاصل کرنے کے لئے کوئی ایسا خاندان بھی ہوگا جو بارات پہ بارات لے جاتے اور لڑکی والوں کو خراب کرتے ہیں۔ وہ سمجھ گئی۔

"ہے جی!" — اُس نے کہا — "بالکل ہماری حیثیت کا ایک خاندان ہے۔ میری حویلی سے اُن کی حویلی بڑی ہوگی۔ وہ زمینوں والے اور جائیداد والے لوگ ہیں۔ اُن کی ایک ہی بیٹی ہے۔ دو بھائی ہیں۔ باپ ہے۔ یہ سب اپنا رعب جمانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ان کی لڑکی خوبصورت ہے لیکن یہ خاندان مجھے پسند نہیں۔ لڑکی کے چال چلن کے خلاف میں کوئی بات نہیں کر سکتی کیونکہ بغیر ثبوت کے کسی کی بیٹی کو بدنام کرنا اچھا نہیں ہوتا، لیکن لڑکی بے پردہ پھرتی رہتی ہے اور بڑی عمر کی عورتوں کی طرح باتیں کرتی ہے۔ اُس کا باپ اور بھائی مجھے اس وجہ سے اچھے نہیں لگتے کہ اپنے جیسا کسی کو سمجھتے ہی نہیں"۔

آپ نے اپنے گاؤں یا محلے میں اس قسم کے کردار دیکھے ہوں گے۔ یہ جرائم پیشہ نہیں ہوتے بلکہ کوئی جرم نہیں کرتے۔ پولیس جنہیں بدمعاش کہتی ہے یہ اُن لوگوں میں سے بھی نہیں ہوتے بلکہ معزز کہلاتے ہیں۔ البتہ اُن کی حرکتیں بدمعاشوں جیسی ہوتی ہیں۔ ضرورت سے زیادہ دلیر ہوتے ہیں۔ ایسے خاندانوں کے بزرگ معاشرتی سرگرمیوں میں، عید میلاد کے جلوسوں کے انتظامات میں اور دیگر سوشل کاموں میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ بلدیاتی انتخابات میں ضرور کھڑے ہوتے ہیں اور اُن کے بیٹے وغیرہ یعنی ان کا نوجوان طبقہ بڑکیں مارتا ہے اور اُن کا انداز آج کل کی پنجابی فلموں کے ہیرو جیسا ہوتا ہے۔

یہ خاندان جو قاضی عبدالمنان کا خاندان کہلاتا تھا، اسی نسل سے تعلق رکھتا تھا جسے میں نے بیان کیا ہے۔ معلوم نہیں یہ خاندان قاضی کیوں کہلاتا تھا۔ قاضی عبدالمنان کی ایک بیٹی جوان تھی جس کا رشتہ وہ اختر کے ساتھ کرنا چاہتا تھا۔ اختر کی ماں پر بے شمار سوال کر کے میں نے جو معلومات حاصل کیں وہ یہ تھیں کہ قاضی کی بیوی نے عورتوں کے کان میں یہ بات ڈالی تھی کہ وہ اپنی بیٹی اختر کو دینا چاہتی ہے۔ عورت نے یہ بات اختر کی ماں تک پہنچا دی تھی۔

اختر کی ماں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ اُسے یاد نہیں آرہا تھا لیکن ایسا ہُوا ہوگا کہ اُس نے قاضی عبدالمنان کے خاندان یا اُس کی بیٹی کے خلاف کوئی بات کہہ دی ہو۔

"مجھے اُن کا ایک پیغام ملا" — اختر کی ماں نے مجھے بتایا — "لڑکی کی ماں نے کہا کہ وہ اختر کا رشتہ کبھی نہیں چھوڑے گی۔ بہتر ہے کہ اختر کی ماں کسی اور طرف نہ دیکھے اور ہم سے بیٹی مانگنے آجائے .... میں نے پرواہ نہ کی۔ یہ تو زبردستی والی بات تھی۔ میں نے کہا کہ میں سوچ کر جواب دوں گی۔ لڑکی کی ماں نے عورتوں سے کہا کہ اختر کی ماں نے کچھ اور سوچا ہُوا ہے تو ہم اُسے خراب کریں گے ....

"میں ایک روز لڑکی کی ماں سے ملی اور اُسے کہا کہ وہ مجھے دھمکیاں کیوں دے رہی ہے؟ وہ صاف مُکر گئی۔ کہنے لگی کہ عورتیں لگائی بجھائی کرتی ہیں، میری کیا مجال کہ ایسی نازیبا بات مُنہ سے نکالوں۔ اُس نے میری خاطر تواضع کی۔ اُس کی بیٹی تو میرے آگے بچھی جاتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ لڑکی کی ماں چالاک عورت ہے۔ اُس نے مجھے دھمکیاں بھیجی تھیں۔ اُس نے اشاروں اشاروں میں مجھے بتایا کہ وہ بیٹی کو کتنا زیور اور کیا کچھ دے رہی ہے۔ میں نے اشاروں اشاروں میں اُسے بتا دیا کہ میں اُس کی بیٹی کا رشتہ مانگنے نہیں آؤں گی۔ میں نے صاف الفاظ میں جو بات کہی وہ یہ تھی کہ میرا بیٹا ابھی چھوٹا ہے، ابھی میں اس کی شادی نہیں کروں گی ....

"پہلے تو یہ لوگ مجھے سر آنکھوں پر بٹھاتے رہے، میرے آگے پیچھے پھرتے رہے، میرے بیٹے کو تحفے دیتے رہے اور سیدھا مجھے کہنے کی بجائے دوسری عورتوں سے کہلواتے رہے کہ لڑکے لڑکی کی منگنی ہو جاتے، شادی خواہ پانچ سال بعد ہو۔ عورتیں مجھے یہ بات مشورے کے طور پر اپنی طرف سے کہتی تھیں لیکن میں اچھی طرح سمجھتی تھی کہ یہ لڑکی کی ماں کا پیغام ہے۔ میں ہر عورت سے یہی کہتی تھی کہ منگنی کی ضرورت نہیں، ایک ہی بار شادی کروں گی لیکن میں نے ابھی یہ فیصلہ نہیں کیا کہ کس کی بیٹی کو اپنی بہو بناؤں گی ....

"اس کے بعد ان لوگوں نے دھمکیاں دینی شروع کر دیں۔ آئے دن کوئی نہ کوئی عورت میرے کان میں ڈال جاتی کہ وہ کہتے ہیں کہ اس گھر میں جائے گی تو اُن کی بیٹی جائے گی، ہم کسی اور لڑکی کو اس گھر میں آباد نہیں ہونے دیں گے۔

قاضی عبدالمنان اور اُس کا بڑا بھائی اختر کے ساتھ بہت پیار کرتے تھے۔ اسے گھر لے جاتے تھے۔ لڑکی کی ماں تو میرے بیٹے کو اپنا بیٹا سمجھتی تھی۔ میں نے اختر کو بتا دیا کہ قاضی اُسے اپنی بیٹی دینا چاہتا ہے اور میں قبول نہیں کر رہی۔ اختر نے تو صاف فیصلہ دے دیا تھا کہ اُسے یہ لڑکی پسند نہیں۔ اس سے مجھے خوشی ہوئی لیکن میں نے اختر سے یہ نہ کہا کہ وہ اِن لوگوں سے ملنا ملانا چھوڑ دے۔"

بہن کا ایک بھائی

اختر کی ماں نے مجھے بتایا کہ قاضی عبدالمنان اور اُس کی بیوی نے دوسری دو لڑکیوں کے ماں باپ کو جو رشتہ اختر کو دینا چاہتے تھے، دھمکایا کہ وہ اختر کو ذہن سے اتار دیں اور اپنی لڑکیاں کسی اور کو دے دیں۔ یہ دونوں خاندان شریف تھے۔ وہ چُپ ہو گئے۔ پھر قاضی عبدالمنان اور اُس کی بیوی اختر کی ماں پر سوار ہو گئے۔ وہ براہِ راست کوئی بات اختر کی ماں سے نہیں کرتے تھے۔ دوسروں سے، عام طور پر عورتوں سے کہتے تھے اور عورتیں یہ باتیں اختر کی ماں تک پہنچا دیتی تھیں۔

"لیکن اُن کے رویّے سے یہ ثابت تو نہیں ہوتا کہ اُنھوں نے آپ کے بیٹے پر حملہ کیا ہے" — میں نے اختر کی ماں سے کہا — "وہ تو آپ کے بیٹے کو چاہتے ہیں!"

"میری ایک بات اور سُن لیں" — اُس نے کہا — "میں بھی ان پر شک نہیں کرتی۔ یہ تو آپ نے پوچھا تو میں نے اتنی لمبی کہانی سُنا دی ہے لیکن کچھ اور بھی ہُوا تھا جس کا مجھے علم نہیں۔ اب بات کرتے کرتے یہ بھی یاد آگئی ہے۔ پانچ چھ دن گزرے، قاضی عبدالمنان میرے ہاں آیا اور کہنے لگا کہ اپنے بیٹے کو سنبھال کر رکھو، مُنہ پھٹ ہو گیا ہے .... میں نے اُس سے پوچھا کہ میرے بیٹے نے کیا کیا ہے تو اُس نے کہا کہ ابھی نادان ہے، اسے ابھی اچھے بُرے کا پتہ نہیں۔ میں اُسے اپنا بچہ سمجھتا ہوں۔ تم اُسے سمجھا دینا۔ میرے بیٹے جوان ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مار کٹائی پر اُتر آئیں ....

"میں نے ایک بار پھر اُس سے پوچھا لیکن اُس نے یہ نہ بتایا کہ ہُوا کیا ہے۔ اختر کہیں باہر نکلا ہُوا تھا۔ گھر آیا تو میں نے اُس سے پوچھا کہ قاضی عبدالمنان نے اس نے کیا بدتمیزی کی ہے۔ اختر ہنس پڑا اور بولا، امی پریشان نہ ہو جایا کریں۔ کچھ نہیں ہُوا۔ میں نے اختر کے دوستوں سے پوچھا۔ اُنہوں نے بھی کچھ نہ بتایا، پھر یہ واقعہ ہو گیا۔"

اس سے مجھے شک ہُوا کہ ضرور اختر اور قاضی کے درمیان کوئی بات ہوتی ہو گی جس پر قاضی نے مارکٹائی کی دھمکی دی تھی۔ اختر کو میں دیکھ چکا تھا۔ وہ لڑنے جھگڑنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ میں نے ماں کو باہر بھیج کر اختر کو بلایا اور اُس سے پوچھا کہ قاضی کے ساتھ کیا بات ہوئی تھی۔

"قاضی صاحب کے ساتھ تو کوئی بات نہیں ہوئی تھی" — اختر نے کہا — "قاضی کے ایک صاحبزادے کی میں نے ذرا مرمت کی تھی۔"

"معلوم ہوتا ہے تم نے اپنے دشمن پیدا کئے ہُوتے ہیں" — میں نے دوستانہ سے لہجے میں کہا — "کل تمہیں ڈنڈے پڑے ہیں، ایک روز تمہارے پیٹ میں چاقو اُترا ہُوا ہو گا۔"

"اللہ سب سے بڑا ہے" — اُس نے جرأت مندی سے کہا — "اللہ کا کوئی بندہ تو ابھی ایسا نہیں دیکھا جو چاقو لے کر میرے سامنے کھڑا رہ سکے۔ مجھے ڈنڈے مارنے والا دلیر ہوتا تو اندھیرے میں مجھ پر پیچھے سے وار نہ کرتا۔"

"یہ دلیری ذرا کم کرو اختر!" — میں نے کہا — "ماں کے اکیلے بیٹے ہو۔ مجھے بتاؤ وہ بات کیا تھی جس پر قاضی نے تمہاری ماں کو دھمکی دی تھی۔"

اُس نے پہلے وہی تفصیل شروع کر دی کہ قاضی اُسے دھونس سے اپنی بیٹی دینا چاہتا ہے۔

"پانچ چھ دن گزرے" — اُس نے کہا — "قاضی کا سب سے چھوٹا بیٹا جو میٹرک تک میرا کلاس فیلو رہا ہے، مجھے بازار میں ملا اور اُس نے سیدھا آتے ہی میرا گریبان پکڑ لیا اور بولا — اوئے اتُو لڑکوں کے ساتھ کیا بکواس کرتا پھرتا ہے؟ — بات یہ تھی کہ میں اپنے دوستوں سے کہتا رہتا تھا کہ قاضی مجھے زبردستی اپنی

بیٹی دے رہا ہے۔ میرے دوستوں سے یہ بات اس لڑکے تک پہنچ گئی۔ اُس نے بازار میں میرا گریبان پکڑ لیا۔ میں برداشت نہ کر سکا۔ میں نے اُس کے سر کے بال مٹھی میں لے کر زور سے ایک طرف جھٹکا دیا۔ اُس کے ہاتھ سے میرا گریبان چھوٹ گیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اُس کے مُنہ پر گھونسہ مارا۔ لوگ بڑے بیوقوف ہوتے ہیں، خواہ مخواہ بیچ میں آجاتے ہیں۔ کئی آدمی ہمارے درمیان آ گئے۔ وہ مجھے گالیاں دے رہا تھا۔ میں گالی نہیں دیا کرتا ....

"ہمیں چھڑانے والے یہ سمجھ کر کہ میں نے ہار مان لی ہے، اِدھر اُدھر ہو گئے۔ وہ کچھ نہ کچھ بکواس کرتا جا رہا تھا۔ میں نے جا کر اُسے پکڑ لیا اور اُس کی خوب پٹائی کی۔ وہ بڑکیں مارنے والا خاندان ہے۔ اندر سے یہ لوگ جو کچھ ہیں وہ میں جانتا ہوں۔ اس لڑکے کے مُنہ پر میرے دو گھونسوں کے نشان پڑ گئے تھے۔ اُس کے باپ نے اُس سے پوچھا ہو گا کہ یہ نشان کیسے ہیں اور اُس نے بتا دیا ہو گا۔"

"اور اُس نے بدلہ لے لیا ہے" — میں نے کہا — "میری نصیحت سنو اختر! میں یقین سے نہیں کہہ رہا کہ اُسی نے تمہیں مارا ہے۔ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔ ایسی غلطی کبھی نہ کرنا کہ اب تم اُس سے بدلہ لو۔ تم اکیلے ہو اور وہ دو بھائی ہیں۔ وہ تمہیں زیادہ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اپنی ماں کا خیال رکھو۔ پہلے وہ تمہارے والد صاحب کا غم بڑی مشکل سے برداشت کر رہی ہے۔ تمہارا غم اُس کی جان لے لے گا۔ میں ابھی مزید تفتیش کروں گا اور صحیح آدمی کو پکڑ لوں گا۔ اُسے بڑی سخت سزا دلاؤں گا۔"

یہ تو میں نے اختر کو ٹھنڈا کرنے کے لئے کہا تھا، مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اسی لڑکے نے اختر سے انتقام لیا ہے لیکن ایسا جُرم ثابت کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ کوئی عینی شاہد نہیں تھا۔ کوئی اور شہادت اور کوئی سراغ نہیں تھا، پھر بھی میں نے ان لوگوں کے متعلق معلوم کرنا ضروری سمجھا۔ میں ان سب کو ڈرانا چاہتا تھا تاکہ لڑکوں کی دشمنی کسی سنگین واردات کا یا بڑوں کی لڑائی کا باعث نہ بن جائے۔ میں نے اختر کی ماں اور اُس کے ساتھ جو آدمی آئے تھے، انہیں بھی اندر بلایا۔ میں نے ان کی

رپورٹ باقاعدہ درج نہ کی لیکن انہیں نہ بتایا۔

"آپ چلے جائیں" ——میں نے انہیں کہا —— "میں تفتیش کروں گا۔ مجھے جو کچھ معلوم کرنا تھا کر لیا ہے" —— اُن آدمیوں سے جو ساتھ آتے تھے، میں نے کہا —— "اگر آپ کو کسی پر شک ہے یا آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں تو کہیں۔ میں پوری بات سنوں گا۔ مجھے آپ سب کی مدد کی ضرورت ہے۔ اب نہیں تو بعد میں سہی۔ آپ کو کسی کے خلاف ذرا سی بھی شہادت ملے تو میرے پاس آجائیں۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ یہ لڑکوں کی آپس کی دشمنی بھی ہو سکتی ہے۔ یہ فرض آپ سب کا بھی ہے کہ اپنے طور پر تفتیش کریں۔ اگر یہ معاملہ لڑکوں کا ہی ہے تو یہ بڑوں کی لڑائی کا باعث نہ بنے۔ یہ ذمہ داری آپ سب کی ہے۔"

اس طرح کی کچھ اور باتیں کہہ کر میں نے انہیں رخصت کر دیا۔ مجھے مسلمانوں کی یہ عادت اکثر پریشان کیا کرتی تھی کہ آپس میں لڑائی جھگڑوں سے باز نہیں آتے تھے۔ ہندوؤں میں یہ عادت نہیں تھی۔ وہ مسلمانوں کا خون بہا دیتے تھے، آپس میں نہیں لڑتے تھے۔ وہ مسلمانوں کی اقلیت کا علاقہ تھا۔ میں انہیں باعزت اور باوقار دیکھنا چاہتا تھا لیکن یہ مسلمان خود آ کر اپنے ہاتھ میری ہتھکڑی میں ڈال دیتے تھے۔

اس کیس میں بھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ یہ ہندوؤں کے سامنے اپنا تماشہ بنا رہے ہیں۔ اختر کی ماں نے مجھے جو باتیں سُناتی تھیں یہ یک طرفہ بیان تھے۔ مجھے اُن کی ہر بات کو سچ نہیں مان لینا چاہیئے تھا۔ اختر کی ماں بہت خوبصورت عورت تھی۔ بیوہ بھی تھی۔ کسی کی محتاج نہیں تھی بلکہ امیر عورت تھی۔

مجھے اس کے متعلق پوری معلومات لینی تھیں۔ دوسری پارٹی کے متعلق بھی کچھ معلوم کرنا تھا۔ مجھے اپنے علاقے میں امن قائم رکھنا تھا۔ امن ہتھکڑیوں، حوالات اور مقدموں کے بغیر بھی قائم رکھا جا سکتا ہے۔

ناجائز دوستی —— ایک کی ماں دوسرے کا باپ

مجھے جب اس ڈرامے کے کرداروں کی رپورٹیں ملنے لگیں تو کچھ اور ہی رنگ سامنے آتے۔ میں نے آپ کو اپنی کہانیوں میں بتایا ہے کہ تھانے کے مُخبر نہایت معمولی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان میں جرائم پیشہ بھی ہوتے ہیں۔ انہیں باقاعدہ اُجرت ملتی ہے لیکن مُخبروں کی ایک قسم اور بھی ہے۔ ان کا شمار معززینِ شہر میں ہوتا ہے۔ یہ حضرات تھانیدار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مُخبری کرتے ہیں۔ انہیں آپ خوشامدی اور چُغل خور کہہ سکتے ہیں۔ یہ جسے چاہتے ہیں پولیس کی نظروں میں گرا دیتے اور اُسے مشکوک چال چلن کا آدمی بنا دیتے اور بدمعاشوں کو معزز بنا دیتے ہیں۔

اختر پر حملہ معمولی واقعہ نہیں تھا۔ سارے قصبے میں اس واقعہ کی خبر پھیل گئی تھی۔ معزز مُخبر خود ہی میرے پاس آ گئے۔ اگر میں ہر ایک کی رپورٹ سنانے لگوں تو بات بڑی لمبی ہو جائے گی۔ صرف ایک رپورٹ سناتا ہوں۔ یہ شخص شہر میں باعزت حیثیت کا آدمی تھا۔ اُس نے پہلے تو مجھ سے یہ وعدہ لیا کہ میں کسی کو پتہ چلنے نہ دوں کہ یہ رپورٹ اُس نے دی ہے۔

"میں کسی کو اپنا دشمن نہیں بنانا چاہتا" —— اُس نے کہا —— "لیکن میں آپ کی مدد کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ میری اتنی زیادہ عزت کرتے ہیں۔"

حقیقت یہ تھی کہ کوئی تھانیدار اس قسم کے آدمیوں کی دل سے عزت نہیں کرتا۔ انہیں مخبر بنائے رکھنے کے لئے ان کی عزت کی جاتی ہے جو محض بناوٹی ہوتی ہے۔

"یہ عورت (اختر کی ماں) اچھے چال چلن والی نہیں" —— وہ کہہ رہا تھا —— "قاضی عبدالمنان ہے نا! یہ کیوں اپنی بیٹی اختر کو دے رہا ہے؟ ....صرف اس لئے کہ اس عورت کے ساتھ اُس نے جو یاری لگا رکھی ہے اس پر کوئی شک نہ کرے۔"

"کسی نے یا آپ نے انہیں اکٹھے دیکھا ہے کبھی؟"

"میں نے دو مرتبہ رات کو اُسے اس عورت کے گھر سے نکلتے دیکھا ہے" — اُس نے کہا — "چار پانچ دن گزرے اختر اور قاضی کے بیٹے کی لڑائی ہوتی تھی۔ قاضی کے بیٹے نے اس طرح انتقام لیا کہ اختر پر رات کو حملہ کیا۔"

"آپ کوئی ثبوت تو پیش نہیں کر سکتے" — میں نے کہا — "شک مجھے بھی یہی ہے لیکن کسی نے دیکھا تو نہیں۔"

"دو آدمیوں نے دیکھا تھا" — اُس نے کہا — "یہ دونوں آدمی آپ کے اپنے ہیں۔ میں جانتا ہوں یہ دونوں آپ کے مُخبر ہیں۔"

اُس نے ان دونوں کے نام بتائے۔ یہ دونوں جرائم پیشہ تو نہیں تھے لیکن شریف آدمی بھی نہیں تھے۔ تین چار کیسوں میں اُنہوں نے مُخبری کی تھی۔ میں نے انہیں باقاعدہ مُخبر بنا لیا تھا۔ اس معزز مُخبر نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ قاضی عبدالمنان نے اختر کی ماں کے ساتھ ناجائز دوستی لگا رکھی ہے۔ قاضی کی عمر ساٹھ سال سے اوپر ہو چکی تھی۔ میں آج کل کی نسل کو بتانا چاہتا ہوں کہ اُس زمانے میں ساٹھ سال کی عمر میں جوانی کی رمق باقی رہتی تھی۔ صحت کا معیار کچھ اور ہوتا تھا۔ آج کل تو چالیس سال کا آدمی ساٹھ سال کا لگتا ہے۔

"لیکن چوہدری صاحب!" — میں نے اس معزز خوشامدی سے کہا — "مجھے بتایا گیا ہے کہ اختر کی ماں قاضی کی بیٹی کو قبول ہی نہیں کر رہی!"

"آپ خود سیانے ہیں ملک صاحب!" — اُس نے کہا — "قاضی کا خیال ہے کہ لڑکی لڑکے کی شادی ہو جانے تو میل ملاقات میں سہولت ہو جائے گی لیکن اختر کی ماں بڑی محتاط عورت ہے۔ اُس نے اپنے اوپر شرافت کا پردہ ڈال رکھا ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ بہو گھر میں آگئی تو میل ملاقات مشکل ہو جائے گی۔"

"آپ کی سوچ بڑی گہرائی تک جاتی ہے چوہدری صاحب!" — میں نے کہا۔

"آپ کی کرم نوازی ہے ملک صاحب!" — اُس نے خوشامدیوں کی طرح آگے جھک کر اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "میں تو چہرہ دیکھ کر بتا دیا کرتا

ہوں کہ اس شخص کے دل میں کیا ہے.... آپ کے وہ دونوں آدمی میرے ساتھ آئے ہیں۔ حکم ہو تو پیش کر دوں!"

اُسے باہر بھیج کر میں نے ان دو میں سے ایک کو بُلایا۔ اُس نے اپنے ساتھی کا نام لے کر مجھے بتایا کہ وہ دونوں رات کو ایک گلی میں جا رہے تھے۔ انہوں نے قاضی عبدالمنان کے چھوٹے بیٹے کو دیکھا۔ اُس کے ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا تھا۔ وہ بہت تیز چلتا آ رہا تھا اور بار بار پیچھے دیکھتا تھا۔ وہ سیدھا اُن کی طرف آتے آتے ایک اور گلی میں مُڑ گیا۔ یہ دونوں آدمی سیدھے آگے نکل گئے۔ اختر پر حملہ ساتھ والی گلی میں ہُوا تھا۔

میں نے دوسرے مُخبر کو بلایا۔ اُس نے بھی یہی بیان دیا۔ انہیں صبح ہونے پر پتہ چلا کہ اختر پر حملہ ہُوا ہے۔ ان دونوں نے آپس میں بات کی تو دونوں کا خیال قاضی کے بیٹے پر گیا۔ اس مُخبر نے مجھے گلیوں کا نقشہ سمجھایا۔ میں نے ان دونوں پر جرح کی تھی۔ دونوں نے مجھے حملے کا جواز بھی بتا دیا تھا۔ میں نے دونوں سے قاضی اور اختر کی ماں کے تعلقات کے متعلق پوچھا تھا۔ دونوں نے کہا کہ ان کے تعلقات اتنے خفیہ ہیں کہ کسی کو شک تک نہیں ہوتا۔

میں نے قاضی عبدالمنان کے بیٹے کو بلوایا۔

ٹکر قاضی اور چوہدری کی

یہ لڑکا آیا۔ اُس کا باپ بھی ساتھ ہی آگیا۔ قاضی کی عمر تو ساٹھ سال ہی ہو گی لیکن تندرستی کے لحاظ سے ساٹھ سے بہت کم کا لگتا تھا۔ وہ میرے پاس آگیا اور اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے اُس کے بیٹے کو کیوں بلایا ہے۔ میں نے اُسے بتایا تو وہ پریشان ہو گیا۔

"میں کبھی نہیں کہوں گا کہ میرا بیٹا نیک پاک لڑکا ہے" — اُس نے کہا — "لیکن یہ اتنا بُزدل نہیں کہ اندھیرے میں پیچھے سے وار کرے گا۔ کل شام کے بعد یہ باہر نکلا ہی نہیں۔"

"آپ لڑکے کو میرے پاس بھیج دیں" — میں نے کہا — "میں اُس

سے کچھ پوچھ لوں پھر آپ سے بات کروں گا۔"

میرے بار بار کہنے کے باوجود وہ نہیں اُٹھ رہا تھا۔ اُس نے بیٹے کو باہر بٹھا دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ پہلے میں اسی سے کچھ پوچھ لوں۔ اس کے بعد اس کے بیٹے سے پوچھ گچھ کروں گا۔ دونوں کے بیانوں میں ضرور فرق ہو گا۔

"اختر کی اور آپ کے بیٹے کی لڑائی کیوں ہوتی تھی؟"—میں نے پوچھا۔

"ناسمجھ لڑکے ہیں"—اُس نے جواب دیا—"میرے بیٹے کے مُنہ پر نشان تھے۔ میں نے پوچھا تو اُس نے مجھے بتایا کہ اختر کہتا پھرتا ہے کہ قاضی مجھے زبردستی اپنی بیٹی دے رہا ہے۔ میرا بیٹا بچہ تو نہیں۔ غیرت میں آکر اُس نے اختر کی خوب پٹائی کی۔"

"میرا تو خیال ہے کہ اختر نے آپ کے بیٹے کی پٹائی کی تھی"—میں نے کہا۔

"توبہ کرو جی!"—قاضی نے رُعب سے کہا—"وہ لڑکیوں جیسا لڑکا میرے بیٹے کی کیا پٹائی کرے گا۔ میرے بیٹے کے مُنہ پر دو گھونسے لگ گئے تھے۔ جن لوگوں نے انہیں چھڑایا ہے اُن سے پوچھیں کس نے کس کی ہڈیاں توڑی تھیں۔"

"پھر آپ نے کیا کیا تھا؟"

"میں نے پہلے تو اپنے بیٹے کو بُرا بھلا کہا کہ اُسے لڑائی نہیں کرنی چاہیے تھی"—قاضی عبدالمنان نے جواب دیا—"وہ مجھے بتاتا اور میں اختر کی ماں سے گلہ کرتا .... مجھے ان کا بہت خیال ہے جی! اختر یتیم بچہ ہے۔ ماں اُس کی بیوہ ہے۔"

"آپ نے تو اُسے بڑی زوردار دھمکی دی تھی"—میں نے کہا۔

"اتنی زوردار تو نہیں"—اُس نے کہا—"مجھے غصہ ضرور آیا ہوا تھا۔ میرا مطلب تھا کہ ماں اختر کو اچھی طرح سمجھا دے۔"

"اب بھی آپ اپنی بیٹی کا رشتہ اختر کو دینا چاہیں گے؟"

"میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا"—اُس نے جواب دیا۔

"شاید اختر کی ماں رضامند نہیں"—میں نے کہا۔

"بات کچھ ایسی ہی ہے"—اُس نے کہا۔

"آپ کے آگے وہ انکار نہیں کر سکتی"—میں نے کہا—"آپ کے ساتھ تو اُس کا بڑا گہرا میل جول ہے۔"

"میرا؟"

"جی ہاں قاضی صاحب!"—میں نے کہا—"میں آپ ہی کی بات کر رہا ہوں۔ کیا آپ اُس کے گھر جایا نہیں کرتے؟"

"میں؟"—اُس نے حیران ہو کر کہا—"وہ پردہ دار عورت ہے جی! میں نے شاید اپنے گھر میں ایک دو مرتبہ اتفاقیہ اُس کی صورت دیکھی ہو گی۔ دیکھا جائے تو میرے دل میں اُس کا درجہ بہن والا ہے لیکن میں غیر مرد ہوں۔ بیوہ کی ہے میں تو مجھے اُس کے پردے کا پہلے سے زیادہ خیال رہتا ہے۔"

"پھر آپ نے اُسے دھمکی کس طرح دی تھی؟"

"میں اُس کے دروازے کے باہر تھا اور وہ اندر دروازے کے پیچھے تھی"—اُس نے جواب دیا۔ "کیا اُس نے آپ کو یہ بتایا ہے کہ میں اُس کے گھر کے اندر اُس کے سامنے چلا گیا تھا؟ اگر اُس نے ایسا الزام مجھ پر لگایا ہے تو خدا کے واسطے اُسے میرے سامنے لائیں۔"

"یہ میں بعد میں دیکھوں گا"—میں نے کہا—"میری اس میں کوئی دلچسپی بھی نہیں کہ آپ کس کے گھر جاتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ البتہ یہ رپورٹ آپ کے کچھ خلاف جاتی ہے کہ آپ لوگوں کو دھمکیاں دینے کے عادی ہیں۔ اس طرح فساد بڑھتا ہے، کم نہیں ہوتا۔"

"میں نے کبھی بلاوجہ کسی کو دھمکی نہیں دی"—اُس نے کہا۔

دھمکیوں کے متعلق اس کے ساتھ بہت باتیں ہوئیں اور میں بات کا رُخ اُن دو گھروں کی طرف لے گیا جو اپنی بیٹیاں اختر کو دینا چاہتے تھے۔ قاضی عبدالمنان نے انکار نہ کیا لیکن کہنے لگا کہ اُس نے دھمکی نہیں دی تھی، یہ کہا تھا کہ اختر کو

میں داماد بنانے کی کوشش کر رہا ہوں اور تم لوگ میرے راستے میں آ رہے ہو۔ قاضی نے انہیں یہ بھی کہا تھا کہ اس طرح ایسی دشمنی شروع ہو جاتی ہے جو اگلی نسلوں تک جاتی ہے۔

"پھر انہوں نے آپ کی بات مان لی تھی؟" — میں نے پوچھا — "وہ پیچھے ہٹ گئے تھے؟"

"اِن میں سے ایک اکڑ گیا تھا" — قاضی نے جواب دیا۔ — "آپ جانتے ہیں۔ آپ کے پاس آتا رہتا ہے .... چوہدری شمس الحق .... وہ اچھی سرشت کا آدمی نہیں۔ ایک طرف اُس نے آپ کے ساتھ اور تھانے کے عملے کے ساتھ یاری لگا رکھی ہے، اُدھر اُس کا یارانہ بدمعاشوں کے ساتھ ہے۔ روپے پیسے والا ہے۔"

چوہدری شمس الحق وہی آدمی تھا جو مجھے قاضی عبدالمنان کے متعلق بتا گیا تھا کہ اختر کی ماں کے ساتھ اُس کا ناجائز تعلق ہے۔

"کون سے بدمعاشوں کے ساتھ اُس کا یارانہ ہے؟" — میں نے پوچھا۔

اُس نے چار نام لئے۔ دو وہی تھے جو میرے مُخبر تھے۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ اُنہوں نے واردات کی رات قاضی کے چھوٹے بیٹے کو ڈنڈا ہاتھ میں لئے ایک گلی میں دیکھا تھا۔ اب میں نے چوہدری شمس الحق اور ان دو آدمیوں کے نام قاضی سے سُنے تو مجھے کچھ اور شک ہوا۔ میں نے قاضی سے اس ضمن میں ذرا گہری پوچھ گچھ شروع کر دی۔ کچھ پردے اُٹھے۔ معلوم ہوا کہ قاضی اور چوہدری کے درمیان خاصی کھینچا تانی ہو چکی ہے اور دھمکیوں کا تبادلہ بھی ہوا ہے۔ قاضی کو اپنے بیٹوں پر اور چوہدری کو پولیس اور بدمعاشوں کی یاری پر ناز تھا۔ قاضی نے صاف کہا کہ وہ پولیس سے ڈرتا ہے، ورنہ بدمعاشوں کی وہ اور اس کے بیٹے پرواہ کرنے والے نہیں۔

"چوہدری تو یہ بھی کہتا پھرتا ہے کہ قاضی کو یہ داماد زندہ نہیں ملے گا" — قاضی عبدالمنان نے کہا — "اور جناب ملک صاحب! اس بدطینت انسان نے اختر کی ماں کو بھی بدنام کرنے کی کوشش کی ہے لیکن سب جانتے ہیں کہ وہ شریف اور پردہ دار عورت ہے" — وہ اچانک چُپ ہو گیا اور ذرا سوچ کر بولا — "میں کسی پر الزام تھوپنا اچھا نہیں سمجھتا لیکن یہاں میرا بیٹا مشتبہ بن گیا ہے اس لئے اپنا شک ظاہر کرتا ہوں۔ آپ اس پر غور کریں کہ اختر کو چوہدری شمس نے ہی مروانے کی یا ڈرانے کی کوشش کی ہو گی۔"

مجھے یاد آ رہا تھا کہ مسلمانوں کے اِن محلّوں کے ایک معزز آدمی نے جو واقعی معزز تھا، مجھے بتایا تھا کہ یہ قاضی اور یہ چوہدری دونوں بدمعاش خاندان ہیں۔

میں نے قاضی کو باہر نکال کر ایک کانسٹیبل کو اُن دو بدمعاش مخبروں کے نام بتا کر جو چوہدری شمس کے ساتھ آتے تھے، کہا کہ انہیں فوراً تھانے لے آئے۔ میں نے اس دوران قاضی کے بیٹے کو اندر بلا کر تفتیش کی۔ لڑکا یہ بھی اختر کی طرح سترہ سال کے لگ بھگ تھا اور پختہ زبان میں بات کرتا تھا۔ اُس نے میرے سوالوں کے جو جواب دیتے، اُن سے یہی پتہ چلتا تھا کہ اختر نے اُسے نہیں بلکہ اُس نے اختر کو مارا ہے اس لئے انتقام لینے کے لئے اُسے پیچھے سے وار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے اُسے باہر بٹھا دیا اور دو مخبروں کے انتظار میں تھانے کے دوسرے کسی کام میں لگ گیا۔

سب جھوٹ نکلا

وہ دونوں کچھ دیر بعد آ گئے۔ میں نے ایک کو اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔ وہ پہلے والی بے تکلفی سے کرسی پر بیٹھنے لگا تو میں نے تھانیداروں کی زبان میں اُسے کہا کہ وہ کھڑا رہے۔ میں نے اُسے جو گالی دی، وہ آج کسی کے مُنہ سے سُنتا ہوں تو مجھے غصہ آ جاتا ہے۔ تھانیداری کے زمانے میں یہ گالی میں خاص موقعوں پر خاص قسم کے آدمی کو دیا کرتا تھا۔

"کیا قصور ہو گیا ہے حضور؟" — اُس نے بھکاریوں کے لہجے میں پوچھا۔

"اپنا قصور اپنی زبان سے سناؤ"ـــــ میں نے کہا ـــــ "تمہاری بچت کی صورت یہی ہے ... چلو، بولو۔"

"کچھ اشارہ تو ملے سرکار!"

"تم میرے آگے جھوٹ بول کر گئے ہو"ـــــ میں نے کہا ـــــ "اپنے آپ کو حراست میں سمجھو۔ میں تمہیں سوچنے کی مہلت دیتا ہوں"ـــــ میں نے ایک کانسٹیبل کو بلا کر کہا ـــــ "اسے اپنی نگرانی میں رکھو اور دوسرے ساتھی کو اندر بھیجو۔"

"کیوں او تے!"ـــــ اسے میں نے زیادہ دلچسپ اور سنسنی خیز گالی دے کر کہا ـــــ "بتا، سچ بولے گا یا اُسی جھوٹ پر قائم رہے گا جو تُو چوہدری شمس کے ساتھ آکر بول گیا ہے؟"

"کیسا جھوٹ جناب؟"

"مجھ سے مت پُوچھ!"ـــــ میں نے قہر کی آواز میں کہا ـــــ "تیرا باپ یہ باہر بیٹھا ہے۔ اس سے پُوچھ۔ یہ سچ بول کر جان چھڑا گیا ہے۔ نہیں تو جھوٹ بول اور دیکھ تیری ہڈیاں کس طرح ٹوٹتی ہیں۔ تھانے میں تیری ماں کا خصم بیٹھا ہُوا ہے ناجو تیرے جھوٹ کو سچ مان لے گا ... چوہدری شمس سے کیا انعام ملا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں جناب!"

"چوہدری شمس بھی آرہا ہے"ـــــ میں نے کہا ـــــ "تم اس کا پھندہ اپنے گلے میں ڈال رہے ہو۔"

اُس کا رنگ اُڑ گیا تھا اور میں اُس پر گولہ باری کرتا جا رہا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ اُس کے ساتھی نے سچ بول دیا ہے۔ وہ عادی مجرم تو تھا نہیں کہ برداشت کرتا چلا جاتا۔ آخر وہ بول پڑا۔ اُس نے کہا کہ چوہدری شمس کے کہنے پر اُس نے اور اُس کے ساتھی نے جھوٹ بولا تھا کہ اُنہوں نے قاضی عبدالمنان کے بیٹے کو ڈنڈا ہاتھ میں لئے اور تیز تیز چلتے ایک گلی میں جاتے دیکھا تھا۔

"اور یہ بھی جھوٹ ہے کہ قاضی عبدالمنان کے اختر کی ماں کے ساتھ تعلقات ہیں"ـــــ اُس نے کہا ـــــ "چوہدری شمس صاحب قاضی کو اور اختر کی ماں کو بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ اختر کی اور قاضی کے

بیٹے کی لڑائی ہوتی تھی۔ یہ تو ہر کسی کو معلوم ہے کہ اختر پر حملہ ہُوا ہے۔ چوہدری صاحب نے ہم دونوں کو بُلا کر کہا کہ قاضی کے بیٹے کو پھنسانے کا یہ اچھا موقع ہے۔ چوہدری صاحب کو خدا نے بڑا تیز دماغ دیا ہے۔ انہوں نے ہمیں کہا کہ ہم یہ بیان دیں۔"

چوہدری شمس نے ان دونوں کو قاضی عبدالمنان اور اختر کی ماں کو بدنام کرنے کے لئے استعمال کیا تھا۔ ہمارے معاشرے میں آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کا دماغ چوہدری شمس کی طرح شرارت اور شیطانی کے سوا کچھ سوچتا ہی نہیں۔ اگر آپ غور کریں تو پاکستان کی سیاست میں بھی آپ کو چوہدری شمس ہی نظر آئیں گے۔

اس انکشاف سے مجھے بہت غصہ آیا۔ یہ لوگ مجھے بیوقوف بنا رہے تھے، بلکہ اپنے تعصب اور اپنی سیاست میں مجھے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ میں نے چوہدری شمس کو بھی بلوا لیا۔

"دیکھ چوہدری!"ـــــ وہ جونہی میرے سامنے آیا میں اُس پر برس پڑا ـــــ "تُو اپنی برادری اور محلّے میں معزز ہو گا، تھانے میں تمہاری حیثیت کچھ بھی نہیں۔ اس وقت تُو مشتبہ ہے۔ اختر پر تُو نے حملہ کرایا تھا۔ تیرے دونوں بدمعاش میری حراست میں ہیں۔ انہیں تُو نے پیسے دیئے تھے۔ اقبالِ جُرم کر لے چوہدری! نہیں کرے گا تو میں تیرے ان دونوں بدمعاشوں میں سے ایک کو وعدہ معاف گواہ بنا لوں گا۔"

چوہدری بے ہوش نہیں ہُوا، باقی کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ اُس کی زبان ہکلا رہی تھی۔ وہ ہاتھ جوڑتا اور اپنی بے گناہی ثابت کرتا تھا۔ میں نے اُسے بھی یہ تاثر دے کر کہ وہ ملزم ہے، کانسٹیبلوں کے حوالے کر دیا۔ اسے میں بہت زیادہ ڈرانا چاہتا تھا لیکن مجھے شک بھی تھا کہ اختر پر اسی نے حملہ کرایا ہو گا۔ دیکھنا یہ تھا کہ اُس کے پاس حملے کا جواز کیا تھا۔ کیا ایسا ہُوا ہو گا کہ قاضی کے لڑکے اور اختر کی لڑائی ہوئی اور چوہدری شمس نے قاضی کے لڑکے کو پھنسانے کے لئے اختر پر حملہ کرایا اور تھانے میں آکر رپورٹ دی کہ قاضی کے لڑکے نے حملہ کیا ہے۔

دونوں آدمیوں کو میں نے اے۔ایس۔آئی کے حوالے کر دیا۔ ان دونوں کی خاطر تواضع کی ضرورت تھی کیونکہ وہ بدمعاش تھے۔ چوہدری شمس کو مشتبہ بنا کر بٹھائے رکھا۔ قاضی کے بیٹے پر مجھے شک نہیں رہا تھا لیکن اُسے ذہن سے اُتارا نہیں۔ میرا ارادہ تھا کہ ان لوگوں کا راضی نامہ کرا دوں گا لیکن چوہدری کو میں نے ایسا سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ مرتے وقت تک یاد رکھے۔

معاملہ سنگین ہو گیا

میرے لئے اور بے شمار کام تھے۔ دوسرے کیس زیرِ تفتیش تھے۔ اگلے روز مجھے سیشن کورٹ میں قتل کے ایک مقدمے میں پیش ہونا تھا۔ پچیس چھبیس میل دُور جانا تھا۔ اس سے اگلے روز ڈسٹرکٹ پولیس ہیڈکوارٹر میں جانا تھا۔ چوہدری شمس کو ساری رات تھانے میں رکھا۔ اُس کے دونوں آدمی اے۔ایس۔آئی کے پاس رہے۔ صبح تک دونوں کی طبیعت خاصی بہتر ہو گئی تھی۔ اے۔ایس۔آئی نے رات کو انہیں سونے نہیں دیا تھا اور تھرڈ ڈگری کا پہلا مرحلہ جو ذرا نرم ہوتا ہے، جاری رکھا تھا۔

میں صبح روانہ ہونے لگا تو چوہدری اور اُس کے آدمیوں کو الگ الگ بلا کر کہا کہ میں انہیں چھوڑ رہا ہوں لیکن وہ شہر سے باہر نہیں جا سکتے۔ انہیں چھوڑنے سے پہلے اے۔ایس۔آئی نے مجھے بتایا تھا کہ یہ بے گناہ معلوم ہوتے ہیں۔ چوہدری کے ساتھ بھی اے۔ایس۔آئی نے باتیں کی تھیں۔ چوہدری اُس کے آگے روتا رہا تھا۔

"لیکن ملک صاحب!" — اے۔ایس۔آئی نے مجھے کہا تھا —

"اس چوہدری شمس کو آپ اتنا کچا نہ سمجھیں۔ تھانے کے تین کانسٹیبل اور ہیڈ کانسٹیبل نور الٰہی اسے بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ اس کے جسم میں ایک ہڈی فالتو ہے اور یہ ہڈی شیطان کی ہے۔ اس نے اپنی برادری کو دو دھڑوں میں کاٹ رکھا ہے اور انہیں ایک دوسرے سے لڑاتا رہتا ہے۔ اس کے مُنہ سے خیر کا کلمہ کبھی نہیں نکلا۔ آدمی پیسے والا

ہے۔ پیسے کے زور پر اور پولیس کی دوستی کے دھوکے میں ہر کسی پر رعب جماتا رہتا ہے۔"

میں اُس روز تھانے سے غائب رہا۔ قاضی عبدالمنان اور اُس کے بیٹے کو میں نے پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں شام کے بعد واپس آیا۔ اگلی صبح میں پولیس ہیڈکوارٹر چلا گیا۔ وہاں سے تین ساڑھے تین بجے چھٹی ہوتی۔ واپس آتے شام ہو گئی۔

اگلی صبح ابھی سورج نہیں نکلا تھا کہ تھانے سے ایک کانسٹیبل میرے گھر آیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اختر کی ماں آئی ہے۔ کہتی ہے اختر کل دوپہر کے ذرا بعد گھر سے نکلا تھا پھر واپس نہیں آیا۔ پوری رات گزر گئی ہے۔ وہ تھانے میں بیٹھی رو رہی ہے۔ دو آدمی اُس کے ساتھ ہیں۔

میں بڑی جلدی تیار ہو کر تھانے گیا۔ میرے ذہن میں سب سے پہلے چوہدری شمس آیا۔ اختر کی ماں کی حالت بہت بُری تھی۔ رو رو کر اُس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ مجھ سے اپنا بچہ اس طرح مانگ رہی تھی جیسے اُسے میں نے تھانے میں بند کر رکھا تھا۔ اُس کے ساتھ جو دو آدمی آئے تھے ان میں ایک قاضی عبدالمنان تھا۔ وہ اختر کی ماں جیسا ہی پریشان نظر آ رہا تھا۔

اختر کی ماں نے بتایا کہ اختر گزشتہ روز دوپہر کا کھانا کھا کر گھر سے نکلا۔ وہ اکثر دن کو زیادہ دیر کے لئے غیر حاضر رہتا تھا اس لئے ماں پریشان نہ ہوتی۔ شام کے بعد اختر کو گھر آ جانا چاہیے تھا۔ وہ نہ آیا تو ماں نے اُس کے دوستوں کے گھروں میں جا کر پوچھا۔ کسی نے کہا کہ وہ دن کو فلاں وقت مجھے ملا تھا۔ کسی نے اور وقت بتایا۔ اُس کے دو دوستوں نے بتایا کہ اختر سینما دیکھنے کی کہہ رہا تھا۔

اُس وقت تک اس قصبے میں سینما نہیں آیا تھا۔ پچیس چھبیس میل دُور شہر میں چار سینما ہال تھے۔ وہ شہر چھاؤنی بھی تھا۔ قصبے کے لڑکے وہاں سینما دیکھنے چلے جایا کرتے تھے۔ ماں نے بتایا کہ اختر چند مرتبہ سینما دیکھنے شہر گیا ہے لیکن وہ بتا کر جاتا تھا۔ اُس کے دوستوں نے اُس کی ماں کو پریشان دیکھا

تو دو تین دوست اُس کے ساتھ ہو گئے۔ یہ سب نوعمر لڑکے تھے۔ وہ اختر کی ماں کو تسلیاں دیتے رہے اور رات آدھی گزر گئی۔ لڑکے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ ماں پریشان ہونے کے لئے اکیلی رہ گئی۔

صبح کی اذان کے وقت اُس نے پڑوسیوں کے دروازے کھٹکھٹائے۔ لوگ بہت سویرے جاگا کرتے تھے۔ قاضی عبدالمنان تک خبر پہنچ گئی اور وہ بھی آگیا۔ اُس نے اور پڑوسیوں نے کہا کہ تھانے چلو۔

میں نے پہلا کام یہ کیا کہ چوہدری شمس اور اُس کے انہی دو بدمعاش آدمیوں کو تھانے لانے کے لئے کانسٹیبل کو بھیجا اور اُس کے بعد اختر کی گمشدگی کی باقاعدہ رپورٹ لکھی۔ مجھے سنگین گڑبڑ نظر آرہی تھی۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ لڑکا کچھ زیادہ ہی خوبصورت تھا۔ میں نے اس امکان کو رَد کر دیا کہ یہ واردات اُس کے رشتے سے تعلق رکھتی ہے۔ اختر کی ماں نے ابھی تک کسی سے رشتہ نہیں مانگا تھا اور نہ اُس نے کسی لڑکی کے ماں باپ کو ایسا بُرا جواب بھی نہیں دیا تھا کہ اُس کا کوئی دشمن بن جاتا۔ اختر پر جو حملہ ہُوا تھا، وہ اب مجھے ایک سنگین واردات کی کڑی نظر آنے لگی۔

میں نے فوری طور پر جو کارروائی کی اور اُس روز جو تفتیش کی، اُس کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ مختصر طور پر آپ کو بتا دیتا ہوں۔ میں نے ہر اُس شخص کو تھانے بلا لیا جس پر مجھے ذرا سا بھی شک تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ قاضی عبدالمنان اختر کی ماں کا ہمدرد بن کر آیا ہے۔ میں نے اُس پر ظاہر تو نہ ہونے دیا لیکن اُسے بہانے بہانے سے تھانے میں روکے رکھا۔ اُس کے دونوں بیٹوں کو بھی تھانے بلا لیا۔ چوہدری شمس اور اُس کے بدمعاش دوست بھی آگئے تھے۔

اختر کی ماں کو میں نے تسلی دلاسہ دے کر گھر بھیج دیا۔ میرے لئے یہ کیس خاصا مشکل تھا۔ میں لڑکے کو قتل ہونے سے پہلے ڈھونڈ لینے کی کوشش میں تھا۔ یہ ڈر بھی تھا کہ وہ قتل نہ ہو چکا ہو۔

سیڑھیوں سے گِرا یا درخت سے؟

میں نے قاضی کے چھوٹے بیٹے کو دیکھا۔ اُس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اُسے الگ کر کے پوچھا کہ سر پر زخم کہاں سے آیا ہے۔ کہنے لگا کہ سیڑھیوں سے گِرا تھا۔ میں نے پوچھا سَر کے علاوہ کہاں چوٹیں آئیں ہیں۔ اُس نے کہا کہیں بھی نہیں۔ اُس کے ایک بازو کی کلائی پر نظر پڑی۔ وہاں موٹا سا اُبھار تھا جس کا رنگ نیلا تھا۔ یہ بڑی سخت چوٹ تھی۔

میں نے باہر نکل کر قاضی کے بڑے بیٹے سے ہمدردی کے انداز سے کہا کہ لڑکے کو بڑی سخت چوٹیں آئی ہیں، میں اسے ابھی گھر بھیج دوں گا۔ اسی لہجے میں پوچھا کہ کہیں گِر پڑا تھا؟

"شیطان لڑکے ہیں جی!" — بڑے بھائی نے کہا — "درخت سے گِر پڑا تھا۔"

میرے پوچھنے پر اُس نے وقت اور دن بتایا۔ میں نے اندر جا کر لڑکے سے پوچھا تو اُس نے دن تو ٹھیک بتایا لیکن وقت چار گھنٹے بعد کا بتایا۔ مجھے کوئی شک تو نہیں ہُوا تھا لیکن دونوں بھائیوں کے درمیان جو اختلاف دیکھا تو میرے ذہن میں ایک شک پیدا ہونے لگا۔ میری حالت یہ تھی کہ "میں تھانے سے نہیں جانے دوں گا۔"

"نہ جانے دیں" — وہ یک لخت بیدار ہو گیا اور بڑی جاندار آواز میں بولا — "میری کسی کے ساتھ لڑائی نہیں ہوتی۔"

یہ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ خاندان آج کل کی پنجابی فلموں کے ہیرو جیسا تھا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالوں تو موت کے چہرے پر پسینہ آجاتا ہے۔ قاضی کے یہ دونوں بیٹے اور ان کے چچازاد کسی ایسے ہی ہیرو کی نسل سے تھے۔ اگر یہ لڑکا فوراً بتا دیتا کہ وہ واقعی سیڑھیوں سے یا درخت سے گِرا ہے تو میں اُس پر شک نہ کرتا۔ اُس کے جھوٹ نے اور اُس کی

خاموشی نے اور اُس کے سارے انداز نے مجھے بہت بڑے شک میں ڈال دیا۔

"اختر سے لڑائی ہوتی ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"میری کسی کے ساتھ بھی لڑائی نہیں ہوتی" — اُس نے رُعب دار آواز میں جواب دیا۔

میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور اُسے کہا کہ اس لڑکے کو "اُس" کمرے میں لے جا کر بٹھا دے۔ ہیڈ کانسٹیبل کو معلوم تھا کہ وہ کون سا کمرہ ہے۔ میں فوری طور پر لڑکے پر ذرا سا بھی تشدد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے لڑکے کو اُٹھا لیا۔

"دیکھ کاکا!" — میں نے قاضی کے بیٹے سے کہا — "قمیض پہن لے اور اس کے ساتھ چلا جا۔ یہ تمہیں اکیلا بٹھا دے گا۔ وہاں آرام سے بیٹھ کر سوچنا کہ سچ بولنا ہے یا جھوٹ۔"

اُسے بھیج کر میں نے اُس کے بڑے بھائی کو بلایا۔

"اچھی طرح سوچ کر بتاؤ" — میں نے پوچھا — "تمہارا بھائی سیڑھیوں سے گرا تھا یا درخت سے؟"

"وہ کیا کہتا ہے؟" — اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"میرے سوال کا جواب دو" — میں نے کہا۔

"مجھے اُس نے بتایا تھا کہ درخت سے گرا ہے" — اُس نے جواب دیا — "آپ کو شاید اُس نے یہ بتایا ہے کہ سیڑھیوں سے گرا ہے۔"

"وہ نہ سیڑھیوں سے گرا ہے نہ درخت سے" — میں نے کہا — "اگر تم لوگ مجھ سے عزت کرانا چاہتے ہو اور یہاں سے عزت سے رخصت ہونا چاہتے ہو تو صحیح بات بتا دو۔ صحیح بات یہ ہے کہ وہ کہیں سے بھی نہیں گرا۔ اُس کی کسی کے ساتھ لڑائی ہوتی ہے اور وہ لاٹھیاں یا ڈنڈے کھا کر آیا ہے.... باہر جا کر اچھی طرح سوچ لو۔ اپنے والد صاحب کے ساتھ بھی بات کر لو۔ جب تک مجھے صحیح جواب نہیں ملے گا، میں کسی کو تھانے سے باہر نہیں جانے دوں گا۔"

میں نے بے شمار آدمیوں کو شُبے میں بلا رکھا تھا۔ ان سب سے باری باری سوال جواب کرتا رہا۔ سورج غروب ہو گیا۔ میں نے چوہدری شمس کو اپنے دفتر میں بٹھا لیا اور اُسے کہا کہ وہ لڑکا برآمد کر دے تو میں اُس کے خلاف کیس نہیں بناؤں گا۔ وہ گز گز اُچھلتا اور قسمیں کھاتا تھا۔ میں اُس کی ایک بھی نہیں سن رہا تھا۔ میں تو کسی کی بھی نہیں سُن رہا تھا۔ قاضی عبدالمنان میرے پاس آیا۔

"ملک صاحب!" — اُس نے کہا — "کیا اب ہم جا سکتے ہیں؟ آپ نے میرے دونوں بیٹوں کو یہاں بلا لیا ہے۔ اگر آپ کو ہماری ضرورت نہ ہو تو..."

"آپ اور آپ کے بیٹے ہی تھانے میں نہیں آتے بیٹھے" — میں نے کہا — "آپ دیکھ نہیں رہے میں نے کتنے لوگوں کو بلا رکھا ہے؟ تھوڑی دیر اور رُک جائیں۔"

"میرے بیٹے کو جانے دیں" — اُس نے کہا — "وہ بے چارہ زخمی ہے۔ اُسے بہت چوٹیں آئیں ہیں۔"

"چوٹیں کیسے آ گئیں اُسے قاضی صاحب؟" — میں نے بے تکلفی کے لہجے میں پوچھا۔

"کہیں بھاگتے دوڑتے گر پڑا تھا" — اُس نے کہا۔

"قاضی صاحب!" — میں نے کہا — "آپ اور آپ کے بیٹے آپس میں بات کر کے طے کر لیتے کہ لڑکا کہاں سے گرا تھا تو اِس وقت آپ اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ اپنے گھر بیٹھے ہوتے ہوتے۔ اب آپ کو نہ جانے کب تک میرے گھر میں بیٹھنا پڑے گا۔ آپ باہر تشریف رکھیں۔"

میں نے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ وہ پُوچھ گچھ جاری رکھے۔ اُسے کچھ ہدایات دیں اور میں کھانے اور ذرا استانے کے لئے گھر چلا گیا۔ میں نے ساری رات کام کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ نہ خود سونا تھا نہ کسی کو سونے دینا تھا۔

پرانا مریض لگتا تھا

میں گھر جا کر نہایا، کھانا کھایا اور لیٹ گیا۔ میں اتنا تھکا ہوا تھا کہ لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو پتہ چلا کہ میں تین گھنٹے سو یا رہا ہوں۔ میں پرائیویٹ کپڑوں میں تھانے چلا گیا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ بڑے شہروں میں رات کے گیارہ بجے شام ہوتی ہے۔ قصبوں میں لوگ گیارہ بجے تک سو چکے ہوتے ہیں، پھر بھی بازاروں میں کچھ چہل پہل رہتی ہے۔ میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں اُس وقت قصبوں میں سورج غروب ہونے کے دو گھنٹے بعد تک گلیاں اور بازار سنسان ہو جایا کرتے تھے۔ قصبوں میں سینما اور ہوٹل نہیں ہوتے تھے۔ آج کل کی نسبت آبادی بہت تھوڑی تھی۔

اُس رات میری کہانی والا قصبہ حسبِ معمول سو گیا تھا لیکن میرے تھانے میں رونق تھی۔ اے۔ ایس۔ آئی کسی مشتبہ سے پُوچھ گچھ کر رہا تھا۔ میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ قاضی عبدالمنان میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اُسے تھوڑی سی دیر کے لئے گھر جانے کی اجازت دی جائے۔ میں نے اُسے احترام سے کہا کہ وہ ابھی گھر نہیں جا سکتا۔

وہ ہٹا تو اُس کا بڑا بیٹا میرے سامنے آ گیا۔ اُس نے بھی کہا کہ وہ تھوڑی سی دیر کے لئے گھر جانا چاہتا ہے اور وہ جلدی واپس آجائے گا۔

"باپ بیٹے کو گھر جانے کی کیا جلدی ہے؟" — میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا — "میں تمہارے گھر پیغام بھجوا دیتا ہوں کہ تم، تمہارا بھائی اور تمہارے والد صاحب بالکل خیریت سے ہیں، فکر نہ کریں"۔

"آپ کیوں تکلیف کریں گے؟" — اُس نے کہا — "میں دوڑ کر جاتا ہوں اور دوڑتا آجاؤں گا"۔

میں نے اُسے اور اُس کے باپ قاضی عبدالمنان کو آپس میں ملنے سے روکا ہوا تھا۔ وہ ہٹا تو پھر قاضی میرے پاس آگیا اور اُس نے میرے آگے

ہاتھ جوڑ دیئے۔

"میرے دونوں بیٹوں کو یہیں رکھ لیں مجھے جانے دیں" — قاضی عبدالمنان نے التجا کی — "میں قسم کھا کر کہتا ہوں جلدی آجاؤں گا"۔

"میں دو کانسٹیبل آپ کے ساتھ بھیجوں گا" — میں نے کہا — "یہ آپ کے گھر کے اندر بھی آپ کے ساتھ رہیں گے۔ گھر میں یا کسی اور کے ساتھ آپ ان کانسٹیبلوں کے سامنے بات کریں گے"۔

وہ چُپ ہو گیا اور سر جھکا کر پرے چلا گیا۔

میں اپنے دفتر کی طرف جا رہا تھا تو مجھے کسی کی آواز سنائی دی — "ملک صاحب!" — میں نے دیکھا۔ وہ اُن آدمیوں میں سے ایک تھا جو اختر کی ماں کے ساتھ اختر پر حملے کی رپورٹ دینے آئے تھے۔ اُس نے کہا — "اختر گھر آگیا ہے۔ بُری حالت میں ہے ورنہ میں اُسے ساتھ لے آتا"۔

"کہاں سے آگیا ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"کہتا ہے خدا نے مرنے سے بچا لیا ہے" — اس آدمی نے کہا — "اگر آپ پسند فرمائیں تو گھر چل کر اُس کا بیان لے لیں"۔

"میں پوچھتا ہوں آیا کہاں سے ہے؟"

"کہتا ہے قاضی عبدالمنان اور اُس کے بیٹوں نے اُسے اغوا کرایا تھا" — اُس نے کہا — "اور اپنے باغ کی ایک کوٹھڑی میں قید رکھا ہے"۔

"نکلا کیسے وہاں سے؟"

"فرار ہوا ہے" — اُس نے جواب دیا — "اگر یہ لوگ کہیں کہ انہوں نے اُسے اغوا نہیں کیا تو کرامت (قاضی کے چھوٹے بیٹے) کا جسم دیکھیں، اس پر اور اُس کے سر پر اختر کے ڈنڈوں کے نشان ہوں گے۔ اختر کہتا ہے میرے سامنے لا کر اُس سے پوچھیں کہ یہ نشان کیسے ہیں"۔

میں نے فوراً مان لیا کہ لڑکا ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ایک ثبوت تو یہ تھا کہ کرامت کی چوٹوں کے متعلق مجھے تین جھوٹ سنائے گئے تھے۔ کرامت نے کہا کہ وہ سیڑھیوں سے گرا تھا۔ اُس کے بھائی نے کہا درخت سے گرا تھا

اور اُس کے باپ نے کہا بھاگتے دوڑتے گرا تھا۔ دوسرا ثبوت یہ کہ قاضی اور اُس کا بڑا بیٹا ہاتھ جوڑ جوڑ کر مجھے کہتے تھے کہ انہیں تھوڑی سی دیر کے لئے گھر جانے دیا جائے۔ وہ جاکر اختر کو غائب یا رہا کرنا چاہتے تھے ـــــ میں نے قاضی عبدالمنان اور اُس کے دونوں بیٹوں کو الگ کر کے حراست میں لے لیا اور باقی تمام آدمیوں کو میں نے جانے کی اجازت دے دی، پھر میں اختر کا بیان لینے کے لئے اُس کے گھر چلا گیا۔ وہ پلنگ پر پڑا تھا۔ چہرے سے وہ پرانا مریض لگتا تھا۔ اُس کی ماں روتی اور خدا کا شکر ادا کرتی تھی۔ مجھے دیکھ کر اختر مسکرایا اور کہنے لگا کہ بہت کمزور ہو گیا ہوں۔

ایک خوبصورت جال

مجھے توقع تھی کہ اختر کا بیان لمبا نہیں ہوگا لیکن اُس نے پوری کہانی سنا ڈالی۔ میں نے اُس پر جرح بھی کی اور کچھ شکوک رفع کرتے تھے۔ میں آپ کو اس واردات کا پس منظر اور سارا واقعہ اپنی زبان میں سنا دیتا ہوں۔

اختر نے اُس وقت مجھے یہ بات نہیں سنائی تھی جب وہ حملے کی رپورٹ لے کر ماں کے ساتھ آیا تھا۔ اب اُسے یہ انکشاف بھی کرنا پڑا۔ درمیانے طبقے کے ایک گھر کی لڑکی سے اختر کی محبت تھی۔ اس لڑکی کو عصمت کہہ لیں۔ اصل نام یاد نہیں رہا۔ عصمت تو جیسے اختر کو دیکھ دیکھ کر زندہ تھی۔ اختر امیر گھرانے کا بیٹا تھا، اس لئے ان کی شادی مشکل سے ہی ہو سکتی تھی، پھر بھی اختر نے عصمت کو یقین دلا رکھا تھا کہ وہ اُسی کے ساتھ شادی کرے گا۔ اختر نے ابھی اپنی ماں کو اپنی یہ پسند نہیں بتائی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی ماں کے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرنا چاہتا۔

"عصمت میری ماں کی بہت خدمت کرتی ہے" ـــ اُس نے کہا ـــ "اُس کی ماں مجھے بہت چاہتی ہے۔ اُس کا اپنا کوئی بیٹا نہیں۔ مجھے امید ہے کہ میری امی مان جائے گی۔ عصمت بہت خوبصورت لڑکی ہے۔"

اختر اور عصمت ایک دوسرے کے گھروں میں بے تکلفی سے آتے جاتے تھے۔ تین چار مہینوں سے کرامت (قاضی عبدالمنان کے چھوٹے بیٹے) نے بھی عصمت کے گھر جانا شروع کر دیا تھا۔ اُن کی قریبی رشتہ داری تھی۔ عصمت نے اختر کو بتایا کہ کرامت اُس کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

کرامت کی یہ کوشش بڑھتی گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ عصمت نے کرامت کو صاف کہہ دیا کہ وہ اُس کے ساتھ ایک رشتہ دار سے بڑھ کر کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔ کرامت نے اُسے کہا کہ اختر کے ساتھ تو تم نے بڑا گہرا تعلق رکھا ہوا ہے۔ عصمت نے اُسے یہ بھی بتا دیا کہ اختر کے مقابلے میں وہ کسی کو کچھ نہیں سمجھتی۔

کرامت پھر بھی اُس کے پیچھے پڑا رہا۔ دو تین روز بعد عصمت کے گھر چلا جاتا یا کوئی اور موقع پیدا کر کے عصمت سے ملتا اور اُسے اختر کے خلاف کرنے کی کوشش کرتا۔ عصمت نے ایک روز جل کر اُسے کہا کہ اختر کے سامنے تم بھنگی لگتے ہو، پھر مجھے تنگ کیا تو میں تمہارے ابا کو بتا دوں گی۔

کرامت کے متعلق میں پہلے بتا چکا ہوں کہ آج کل کی پنجابی فلموں کے ہیرو جیسا تھا۔ اپنے آپ کو یہ لوگ نواب سمجھتے تھے۔ کرامت عصمت کی یہ چوٹ کیسے برداشت کر لیتا۔ اُس نے عصمت سے کہا کہ اختر کو ڈھونڈتی رہنا۔ اب تمہیں اُس کی لاش ہی ملے گی۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ اختر نے ہمارے خاندان کی بے عزتی بھی کی ہے۔

اُسی دن یا دوسرے دن اختر اور کرامت کی لڑائی ہو گئی۔ وہ میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ اختر نے کرامت کو بہت مارا۔ پھر اختر پر حملہ ہوا۔ عصمت کو پتہ چلا تو وہ اختر کے گھر گئی۔ وہ بہت پریشان تھی۔ اختر کی ماں باورچی خانے میں گئی تو عصمت نے اُسے بتایا کہ کرامت نے اُسے کیا دھمکی دی تھی۔ عصمت نے کہا کہ تم پر یہ وار کرامت نے ہی کیا ہے۔

دوسرے دن اس کی تصدیق ہو گئی۔ کرامت کھوکھلا نوجوان تھا۔ اُس نے عصمت سے کہا کہ اختر خوش قسمت ہے کہ بچ گیا ہے۔ اگر اُس کی زندگی چاہتی

ہو تو اُس کی دوستی ترک کر دو۔ عصمت پردہ دار اور نوجوان لڑکی تھی۔ اُس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنے ماں باپ کو بتاتی کہ اختر پر وار کرامت نے کیا ہے۔ کرامت نے عصمت سے یہ بھی کہا تھا کہ کسی کو بتاؤ گی تو میں تمہیں سارے شہر میں بدنام کر دوں گا۔

عصمت نے اختر کو بتایا کہ کرامت کیا کہہ گیا ہے۔ اب اختر کو یقین ہو گیا کہ اُس پر حملہ کرامت نے ہی کیا ہے۔

"تم نے دوبارہ تھانے آکر مجھے کیوں نہ بتایا؟" ——میں نے اختر سے پوچھا۔

"میں مر تو نہیں گیا تھا" —— اختر نے کہا —— "میں اپنے ہاتھوں انتقام لینا تھا اور اُس پر بالکل اسی طرح وار کرنا چاہتا تھا جس طرح اُس نے مجھ پر کیا تھا۔"

اختر نے عصمت سے کہا کہ وہ آج ہی موقعہ پیدا کر کے کرامت سے ملے اور اُسے کہے کہ وہ اُس سے ڈر گئی ہے اور اختر کی دوستی چھوڑ رہی ہے۔ پھر اُسے کہے کہ وہ ساتھ والے کھیتوں میں رات کو آجاتے، عصمت اُس کے ساتھ مزید بات کرے گی لیکن عصمت وہاں نہ جاتے۔

عصمت پر جذبات اور غصے کا غلبہ تھا۔ وہ بھی انتقام لینے کو بیتاب تھی۔ کرامت نے خود عصمت کو ملاقات کا موقع دے دیا۔ وہ عصمت کے گھر چلا گیا۔ عصمت نے اُس کے کان میں کہا کہ آج رات فلاں جگہ آجانا۔ اُس نے کرامت سے وہی بات کہی جو اختر نے اُسے بتائی تھی۔

کرامت کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ بہت ہی خوش تھا کہ اُس کی دھمکیاں اور اُس کا وار کام کر گیا ہے۔ اُس نے عصمت سے کہا کہ وہ آجاتے گا۔ عصمت نے اُسی روز اختر کو بتا دیا کہ رات کرامت کھیتوں میں آرہا ہے۔

پھر جال پھینکنے والا جال میں آگیا

اختر کھیتوں میں آگیا۔ گندم کی فصل کمر تک اونچی تھی۔ چاندنی ذرا مدھم

تھی۔ اختر ایک مینڈھ پر بیٹھ گیا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں موٹا ڈنڈا تھا۔ اُسے وہاں بیٹھے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اُسے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اُس نے سر ذرا اوپر کر کے دیکھا۔ اسی کھیت کی دوسری مینڈھ پر کوئی چلتے چلتے رُک گیا تھا۔ اختر نے پہچان لیا۔ وہ پنجابی فلموں کا ہیرو کرامت تھا جو اب وِلن بن چکا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اُسے عصمت کے آنے کی امید تھی۔

"میں اُسے پیچھے سے نہیں مارنا چاہتا تھا" —— اختر نے مجھے بیان دیتے ہوتے کہا —— "میں نے اُسے للکار کر وار کرنا تھا۔ میں اٹھا اور اُس کی طرف چل پڑا۔ وہ آہستہ آہستہ دوسری طرف چل پڑا۔ میں اُس کے قریب پہنچا۔ اُس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ میں نے کہا —— 'منہ میری طرف کر کرامتے! میں بدلہ لینے آیا ہوں' —— اُس نے میری طرف مُڑ کر کہا —— 'جا اوتے، دفع ہو جا یہاں سے۔ گردن توڑ دوں گا' —— میں نے پوری طاقت سے ڈنڈا گھما کر اُس کے سر پہ مارا۔ وہ سر سے ننگا تھا۔ اُس کے مُنہ سے گالی نکلی اور وہ سر پہ دونوں ہاتھ رکھ کر آگے کو جھکا۔ میں نے ایک اور ڈنڈا مارا جو اُس کے بازو پر لگا۔ دو ڈنڈے اُس کی پیٹھ پر مارے۔ وہ بیٹھ چکا تھا۔ میں وہاں سے بھاگا نہیں۔ آہستہ آہستہ چل پڑا۔ ڈنڈا گھما کر پھینکا اور وہ بڑی دُور فصل میں جا گرا۔"

اختر کو معلوم نہیں تھا کہ کرامت بے ہوش ہُوا تھا یا نہیں۔ اختر کو چونکہ سر کے پچھلے حصے پر ڈنڈہ لگا تھا اس لئے اُس کا بے ہوش ہونا لازمی تھا۔ کرامت کو پیشانی سے ذرا اُوپر سر پر ڈنڈہ لگا تھا۔ اُس کی جلد پھٹ گئی تھی۔ چوٹ اگلے حصے پر پڑنے سے اُسے چکر آیا ہو گا وہ بے ہوش نہیں ہُوا ہو گا۔ اب اُس کے سر پر پٹی بندھی ہوتی تھی۔ میں نے اُس کی ایک کلائی پر بھی شدید ضرب کا نیلا اُبھار دیکھا تھا۔

دوسرے دن اختر عصمت کے ہاں گیا اور اُسے بتایا کہ اُس نے رات کیا کیا ہے۔ عصمت بہت پریشان ہوتی۔ اُس نے اختر سے کہا کہ وہ کرامت سے محتاط رہے۔ اختر کو کرامت کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ وہ اب صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کرامت کس حال میں ہے اور کیا اُس نے اپنے گھر والوں کو بتا دیا

ہے یا نہیں کہ اُسے اختر نے مارا ہے اور کیا قاضی تھانے جاتے گا یا نہیں۔

"کیا تمہیں پولیس کا ڈر نہیں تھا؟" —— میں نے اختر سے پوچھا —— "وہ رپورٹ کرتے تو میں تمہیں تھانے بلاتا۔"

"میں بالکل سچ بولتا" —— اُس نے کہا —— "میں کہتا اس نے مجھے مارا ہے، میں نے اسے مارا ہے۔ مجھے گرفتار کرتے ہو تو اِسے بھی گرفتار کرو۔"

میری ہنسی نکل گئی۔ یہ لڑکا مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اُس کی شکل وصورت میں تو کشش تھی ہی، میں اُس کی جرأت، صداقت اور کردار سے بہت متاثر ہُوا تھا۔

کرامت کی طرف سے اُس کی کوئی رپورٹ تھانے میں نہ آئی۔ اُسی روز کا واقعہ ہے۔ اختر دوپہر کا کھانا کھا کر باہر نکلا۔ اُسے دو دوست مل گئے۔ کچھ دیر اُن کے ساتھ رہا پھر بازار کی طرف چل پڑا۔ اُسے کسی نے آواز دی۔ اُس نے رُک کر پیچھے دیکھا۔ کرامت کے بڑے بھائی نے اُسے آواز دی تھی۔ اختر کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا اور وہ اس شخص کے ساتھ لڑائی کے لئے تیار ہو گیا۔ اُسے خیال آیا کہ اس شخص کے ہاتھ میں تو کچھ نہیں، اس کی جیب میں چاقو ہو گا۔ اختر خالی ہاتھ تھا۔ اس نے دل مضبوط رکھا۔

"یار اختر!" —— کرامت کے بھائی نے قریب آکر اختر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بے تکلف دوستوں کی طرح کہا —— "یہ تو کوئی اور ہی گڑبڑ معلوم ہوتی ہے .... جس طرح تم پر کسی نے پیچھے سے ڈنڈے برسائے تھے، گذشتہ رات کرامت کو کسی نے ڈنڈے مارے ہیں۔"

"کہاں تھا وہ؟" —— اختر نے پوچھا۔

"کسی گلی میں جا رہا تھا" —— کرامت کے بھائی نے کہا —— "خود ہی چل کر گھر آگیا۔ اُس کا سر پھٹ گیا ہے۔ سمجھ نہیں آتی کیا کریں۔ یہ کوئی تم دونوں کا دشمن ہے یا کوئی اور شرارت ہے یا کوئی جن بھوت ہے۔"

"تھانے رپورٹ کرنی تھی بھائی جان!" —— اختر نے کہا۔

"تھانے والے کیا کریں گے؟" —— بھائی نے کہا —— "تم نے رپورٹ

کی ہے۔ دیکھ لینا کچھ بھی نہیں ہو گا۔"

اختر کو یہ اطمینان ہُوا کہ کرامت نے اپنے گھر نہیں بتایا کہ اُسے کس نے مارا ہے۔ شاید اس لئے نہیں بتایا کہ وہ خود انتقام لے گا۔ کرامت کا بھائی باتیں کرتے کرتے اختر کو ساتھ لے جا رہا تھا۔

"کرامت کی چوٹیں زیادہ سخت ہیں؟" —— اختر نے پوچھا۔

"چوٹیں جیسی کیسی بھی ہیں ٹھیک ہو جائیں گی" —— کرامت کے بھائی نے کہا —— "کرامت ڈرا ہُوا بہت ہے۔ اُس کے دل پر دہشت بیٹھ گئی ہے۔ تم تو ذرا سا بھی نہیں ڈر رہے تھے۔ میرے ساتھ چلو یار! اُس کے پاس بیٹھو اور اُس کا خوف دُور کرو۔"

اختر نے ذرا پس و پیش کی۔ اُن لوگوں کے ساتھ اُس کے مراسم ذرا بگڑ گئے تھے لیکن کرامت کا بھائی اصرار کر رہا تھا کہ وہ ضرور چلے۔ اختر کو کوئی اور شک نہ ہُوا۔ اُس کا وہاں جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بھائی نے اُسے کہا کہ کرامت اُس کے گھر میں ہے۔ کرامت کا بھائی اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ الگ رہتا تھا۔ یہ خاصی بڑی حویلی تھی جو اُس کے ماں باپ کی حویلی کے ساتھ تھی۔

اُس نے ایسا اصرار کیا کہ اختر نہ چاہتے ہوتے بھی اُس کے ساتھ چلا گیا۔ ڈیوڑھی کے دائیں طرف ایک کمرہ تھا۔ کرامت کے بھائی نے اُسے اس کمرے میں ایک کرسی پر بٹھایا اور یہ کہہ کر اندر چلا گیا کہ کرامت کو یہیں لے آتا ہے۔

چند منٹ گزرے ہوں گے کہ پیچھے سے ایک موٹا کپڑا اختر کے سر پر پڑا اور شاید دو آدمیوں نے اُسے کرسی پر ہی دبا لیا۔ اُسے آوازیں سنائی دیں —— "پاؤں باندھ دے .... کپڑا مُنہ میں دے دے اس کے" —— اس کے ساتھ اُسے گالیاں بھی دی جا رہی تھیں۔ اختر نے دو آوازیں پہچان لیں۔ ایک کرامت کی اور دوسری اُس کے بڑے بھائی کی تھی۔ تیسری آواز کو وہ نہ پہچان سکا۔ شاید ان کے ایک چچازاد بھائی کی تھی —— "اب اس کی ماں اسے

ڈھونڈتی رہے گی۔"

اختر کے ہاتھ پاؤں رسیوں میں بندھ گئے۔ آنکھوں پر اور منہ پر بھی کپڑا بندھ گیا، پھر اُسے اُٹھا کر پلنگ کے نیچے پھینک دیا گیا۔ اُس نے دروازے بند ہونے کی آوازیں سُنیں۔

کوٹھڑی اور کنواری بیٹی

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اختر کو کیا کیا خیال آتے ہوں گے۔ اتنا تو وہ سمجھ گیا تھا کہ کرامت نے گھر جا کر بتایا کہ اُسے اختر نے مارا ہے تو دونوں بھائیوں نے انتقام کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ اختر کو دھوکے میں جال میں لایا گیا۔ اسے اپنے انجام کا علم نہیں تھا۔

رات کو اختر کو پلنگ سے گھسیٹ کر باہر نکالا گیا اور اسے دو آدمیوں نے اٹھا لیا اور باہر لے گئے۔ راستے میں اِن میں سے کسی نے کوئی بات نہ کی وہ ایک جگہ رُکے۔ اختر کو دروازہ کھُلنے کی آواز آئی۔ اُسے اندر لے جا کر فرش پر بٹھا دیا گیا۔ اسے لانے والے چلے گئے۔ دروازہ بند ہُوا اور خاموشی ہوگئی۔

اُسے وقت کا ذرا سا بھی احساس نہیں تھا۔ کئی گھنٹوں بعد دروازہ کھُلا۔ اختر پہلو کے بل لیٹا ہُوا تھا۔ وہ بہت تکلیف میں تھا۔ اُس کے ہاتھ پیٹھ پیچھے اور پاؤں بندھے ہُوئے تھے۔ مُنہ پر کپڑا کَس کر بندھا ہُوا تھا اور ایک کپڑا آنکھوں پر بندھا ہُوا تھا۔ اُس کے اندازے کے مطابق سترہ اٹھارہ گھنٹے گزر گئے تھے۔ اُسے پانی تک نہیں پلایا گیا تھا۔

دروازہ کھلا۔ کوئی اندر آیا۔ اُس نے اختر کی کمر میں بڑی زور سے ٹھُڈ مارا۔ اختر پہلو کے بل پڑا تھا۔ اس آدمی نے جو معلوم نہیں کون تھا، اختر کی پیٹھ پر دونوں کندھوں کے درمیان دو تین ٹھُڈ مارے۔ اُس کے سر کے بال مٹھی میں لے کر اتنے زور سے جھٹکے دے دے کر کھینچے گئے کہ بال اکھڑ گئے۔ اس طرح

اُسے اذیتیں دی گئیں۔ پھر وہ ایک آدمی تھا یا دو تھے، چلے گئے۔

اختر کا جسم دُکھ رہا تھا اور اُس پر غشی طاری ہونے لگی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو بیدار رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ گزرا ہُوا دن تھا جب میں نے قاضی عبدالمنان اور اُس کے دونوں بیٹوں کو، چوہدری شمس اور اُس کے خاص آدمیوں کو اور تین چار اور آدمیوں کو تھانے بٹھا رکھا تھا اور میں تفتیش میں مصروف تھا۔

رات آگئی۔ اختر کو معلوم نہ تھا کہ دن ہے یا رات۔ غشی کی لہر سی آتی اور ایک آدھ منٹ بعد گزر جاتی تھی۔ وہ مرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا۔ اُسے ماں کا خیال بہت پریشان کر رہا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ ماں کو اطلاع ملے گی کہ اُس کا بیٹا قتل ہو گیا ہے تو وہ صدمے سے مر جائے گی یا پاگل ہو جائے گی۔

دروازہ کھُلنے کی آواز آئی۔ اختر کا خیال تھا کہ باہر تالا لگا ہُوا تھا۔ دروازہ کھُلا اور بند ہو گیا۔ اختر نے ایسی آواز سنی جیسے ماچس جلی ہو۔

"اختر!" ۔۔۔ اُسے ایک عورت کی آواز سنائی دی جو سرگوشی سے ذرا اونچی تھی ۔۔۔ "میں مقصودہ ہوں ... کرامت کی بہن ... میں تمہیں یہاں سے نکالنے آئی ہوں۔"

مقصودہ قاضی عبدالمنان کی وہی بیٹی تھی جو وہ اختر کو دینا چاہتا تھا۔ مقصودہ نے اندھیرے میں اختر کے جسم پر ہاتھ پھیرا۔ ہاتھ اختر کے مُنہ پر گیا تو اُس نے اختر کے مُنہ سے کپڑا نکالا۔ اختر بولنے کے قابل ہو گیا۔ اُس نے مقصودہ کو بتایا کہ پیٹھ پیچھے سے اُس کے ہاتھ کھولے۔ مقصودہ شاید بار بار ماچس جلانے سے ڈرتی تھی۔ اُس نے ٹٹول ٹٹول کر رسّی کی گانٹھ تلاش کی اور رسّی کھول دی۔ ہاتھ کھُل گئے تو اختر نے اپنی آنکھوں سے کپڑا اُتارا پھر اپنے پاؤں کھولے اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"یہ کون سی جگہ ہے مقصودہ؟" ۔۔۔ اختر نے پوچھا۔

"یہ ہمارے باغ کے باہر ایک کوٹھڑی ہے" ۔۔۔ مقصودہ نے کہا ۔۔۔ "تم یہاں رُکو نہ میں رُک سکتی ہوں۔ میں کوٹھڑی کے باہر تالا لگا جاؤں گی۔

ایک بات سُنو اختر! میں نے تمہاری جان بچائی ہے۔ تم اللہ پاک کی، رسولِ پاک کی اور قرآنِ پاک کی قسم کھا کر وعدہ کرو کہ کسی کو یہ نہیں بتاؤ گے کہ میں نے تمہیں یہاں سے نکالا تھا۔ بتا دو گے تو باپ اور بھائی مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ انہوں نے تمہیں یہاں بند کیا ہُوا ہے۔ میں نے رات کو بڑے بھائی، چچازاد بھائی اور کرامت کی باتیں سن لی تھیں جو وہ آپس میں کر رہے تھے۔ تب مجھے پتہ چلا کہ انہوں نے تمہیں کہیں سے پکڑ کر یہاں بند کر دیا ہے۔ انہیں پتہ نہ چلا کہ میں نے ان کی باتیں سن لی ہیں....

"آج پولیس پھر سے دونوں بھائیوں کو تھانے لے گئی ہے۔ ابّا جان پہلے ہی گئے ہُوئے تھے۔ انہیں تمہارے گم ہونے کے سلسلے میں تھانے بلایا گیا تھا۔ وہ ابھی تک واپس نہیں آئے۔ ہماری پریشانی کو تم سمجھتے ہو۔ میں نے امّی کو اور بھابی کو نہیں بتایا کہ اُنہوں نے تمہیں یہاں بند کیا ہُوا ہے۔ میں نے کرامت کی الماری دیکھی تو اس کوٹھڑی کے تالے کی چابی مل گئی۔ امّی سو گئی تو میں اُٹھی اور دبے پاؤں باہر نکل آئی۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ چابی اسی تالے کی ہے۔ یہ اسی کی نکلی اور تالا کُھل گیا.... تم میری عزّت کا خیال کرو گے اختر؟"

"مرد قسمیں نہیں کھایا کرتے" — اختر نے کہا — "میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری عزّت کا خیال رکھوں گا.... لیکن مقصودہ! اگر تم یہ امید لے کے آئی ہو کہ میں تمہارے ساتھ شادی کر لوں گا تو یہ نہیں ہو سکے گا۔ تمہارے بھائیوں نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے یہ ہمیشہ کی دشمنی والا سلوک ہے۔"

"تم غلط فہمی میں پڑ گئے ہو" — مقصودہ نے اختر سے کہا — "میں نے اپنے بھائیوں کو بچانے کے لئے تمہیں یہاں سے نکالا ہے۔ اگر تمہیں پولیس یہاں سے نکالتی تو میرے بھائیوں کو ہتھکڑیاں لگتیں اور نہ جانے کتنے سال کی قید ملتی۔"

وہ کوٹھڑی کو تالا لگا کر چلی گئی اور اختر اپنے گھر آ گیا۔ اُس سے چلا نہیں جاتا تھا۔ اُسے کمر اور پیٹھ پر جو ٹُھڈ مارے گئے تھے اور اُسے جو اذیتیں دی گئی تھیں، ان سے وہ اَدھ مُوا ہو گیا تھا۔

میں نے اختر کو، اُس کی ماں کو اور جو آدمی مجھے بلانے گیا تھا، اُسے کہا کہ وہ کسی کو پتہ نہ چلنے دیں کہ اختر آ گیا ہے۔ آدھی رات کا وقت ہے۔ ابھی اختر کی واپسی کا کسی کو پتہ نہیں چلا۔ جب تک میں نہ کہوں، اختر کو کسی کے سامنے نہ کریں۔ میں نے ان لوگوں کو زیادہ سے زیادہ سزا دلانے کی ترکیب کر رہا ہوں۔

میں تھانے چلا گیا۔

"کہاں ہے لڑکا؟"

مجھے کوئی ترکیب ہی کرنی تھی۔ کوئی استادی دکھانی تھی ورنہ میں انہیں سزا نہیں دلا سکتا تھا۔ مشکل یہ پیدا ہو گئی تھی کہ اختر اپنے گھر میں تھا۔ وہ قاضی کے بیٹوں کی قید سے برآمد نہیں ہُوا تھا۔ میں کس بنیاد پر مقدمہ بناتا؟ صرف ایک گواہ قاضی کی بیٹی تھی۔ وہ مر جاتی یہ نہ کہتی کہ اُس نے اختر کو آزاد کیا تھا۔ اب یہ کیس ایسا نہیں تھا کہ میں ان کا راضی نامہ کرا دیتا۔

میں نے پولیس والا دماغ استعمال کیا۔ یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ قاضی کے بیٹے اس سنگین جرم کے مجرم ہیں، اس لئے میری کوئی اُلٹی سیدھی کارروائی کسی بے گناہ پر زیادتی نہیں تھی۔ میں نے تھانے پہنچتے پہنچتے ترکیب سوچ لی تھی۔ میں نے قاضی کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ اختر کو برآمد کرائے۔

"اختر کو میں برآمد کراؤں؟" — اُس نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

"قاضی صاحب!" — میں نے اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا — "اگر آپ ذِلت اور رسوائی سے بچنا چاہتے ہیں تو بیان دے دیں کہ اختر آپ کے قبضے میں ہے۔ رات کا وقت ہے۔ کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔"

اُس نے پھر بھی ٹال مٹول کی۔ میں نے اُسے باہر بھیج کر اُس کے بڑے بیٹے کو اندر بلایا اور اُسے کہا کہ وہ اختر کو برآمد کرا دے۔ اُس نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔

"اپنے باپ کی عزّت کا تمہیں ذرا سا بھی خیال نہیں؟" — میں نے کہا — "میں تمہاری بیوی، تمہاری کنواری بہن اور تمہاری ماں کو بھی تھانے بلاؤں گا۔ وہ

کُرسی تم اپنے سر پر اٹھا کر تھانے لاؤ گے جس پر تم نے اختر کو دھوکے میں لے جا کر اپنے گھر بٹھایا تھا .... بولو، لڑکا تم خود دو گے یا اُس کوٹھڑی میں سے خود جا کر برآمد کر دوں! .... اپنے اُس چچازاد کا نام بتاؤ جو تمہارے ساتھ تھا۔"

اُس کی تو زبان بند ہو گئی تھی۔ میں نے اُٹھ کر اپنا ذرا سا کرتب دکھایا تو اُس نے اُس چچازاد کا نام اور گھر کا پتہ بتا دیا۔ میں نے باہر نکل کر ایک ہیڈ کانسٹیبل کو یہ نام اور پتہ بتا کر کہا کہ اُسے تھانے لے آئے۔

بڑے بھائی کو کچھ اور پوچھے بغیر بھیج دیا اور کرامت کو بلایا۔ اس سے پوچھا کہ اب بتاؤ یہ چوٹیں کیسے آئی ہیں؟

"اب ہمت کر اور جھوٹ بول!" — میں نے کہا — "میں تجھے اُس جگہ لے جاؤں گا جہاں تجھے ڈنڈے پڑے تھے پھر تمہیں اُس کوٹھڑی میں لے جاؤں گا جہاں تم سب نے اختر کو بند کر رکھا ہے۔"

اُس کا رنگ زرد ہو گیا اور اُس کے ہونٹ خشک ہو کر سفید ہو گئے۔ یہ گھبراہٹ کی انتہا ہوتی ہے۔ میں نے اُس سے اور کچھ نہ پوچھا۔ اُسے اُس کے بھائی اور باپ کو اس طرح ساتھ لیا کہ ہر ایک کے ساتھ ایک کانسٹیبل تھا اور انہیں ایک دوسرے سے دُور رکھا۔ قاضی عبدالمنان سے کہا کہ مجھے اپنے گھر تک لے چلے۔

اُس کے دروازے پر پہنچے تو میں نے قاضی سے کہا کہ دروازہ کھلوائے۔

اُس نے دستک دی تو اُس کی بیوی نے دروازہ کھولا۔ میں نے کرامت سے کہا کہ باغ والی کوٹھڑی کی چابی نکال لے۔ وہ میرے مُنہ کی طرف دیکھتا رہا۔

"قاضی صاحب!" — میں نے اُس کے باپ سے کہا — "میں ابھی تک آپ کو آپ کہہ رہا ہوں حالانکہ آپ ایک سنگین جُرم کے مجرم ہیں۔ اس لڑکے سے کہیں کہ اپنی الماری سے اُس کوٹھڑی کی چابی نکال دے جس میں تم لوگوں نے ایک بیوہ کے اکلوتے بیٹے کو بند کر رکھا ہے۔ اگر نہیں مانو گے تو محلے کے معززین کو جگا کر اُن کے سامنے تمہارے گھر کی تلاشی لوں گا اور تینوں کو ہتھکڑیاں لگا لوں گا۔"

قاضی منت سماجت پر آ گیا اور مجھے اندر چلنے کو کہا۔ میں اُس کے ساتھ اندر گیا تو اُس نے کہا کہ یہ نادان لڑکے ہیں۔ آپس میں لڑتے لڑتے اتنی غلط حرکت کر بیٹھے ہیں کہ اُس لڑکے کو کوٹھڑی میں بند کر دیا ہے۔ دیکھیں نا، اُس (اختر) نے میرے بیٹے کا سَر کھول دیا ہے۔

"آپ تو کہتے تھے کہ بھاگتے دوڑتے گر پڑا ہے" — میں نے کہا — "اب آپ جھوٹ بول رہے ہیں کہ اسے اختر نے مارا ہے۔"

منت سماجت کے علاوہ قاضی نے رشوت پیش کی۔ میں نے کہا پہلے مجھے لڑکا دیں۔

مختصر یہ کہ کرامت نے چابی نکال دی اور ہم سب باغ والی کوٹھڑی میں گئے جو باغ کے ساتھ تھی۔ یہ سبزیوں کا باغ تھا جو قاضی کی ملکیت تھا۔ میرے پاس ٹارچ تھی۔ کوٹھڑی کا تالا بڑے بھائی نے کھولا۔ لڑکا تو اندر تھا نہیں۔ میں نے اندر جانے سے پہلے بڑے بھائی سے پوچھا کہ لڑکے کو کون کون یہاں لایا تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ خود تھا اور ساتھ چھوٹا بھائی اور ایک چچازاد بھائی تھا۔

"اُسے یہاں بند کرنے کا مشورہ تمہارے والد صاحب نے دیا تھا؟"

"جی!" — اُس نے اتنا ہی جواب دیا۔

میں اندر گیا۔ ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ بڑی غلیظ کوٹھڑی تھی۔ دو رسیاں اور دو کپڑے پڑے تھے۔ میں نے جو کچھ سوچا تھا، اس کے مطابق کوٹھڑی کو اچھی طرح دیکھا۔ ایک دیوار میں دریچہ سا تھا جس میں لکڑی کے تین ڈنڈے سلاخوں کی طرح لگے ہوتے تھے۔ میرا مسئلہ حل ہو گیا۔

"کہاں ہے لڑکا؟" — میں نے پوچھا۔

"آپ خواہ مخواہ ہم پر الزام لگا رہے ہیں" — قاضی نے چالاک بننے کی کوشش کی — "ہم عزت دار لوگ ہیں۔ ہم لڑکوں کو اغوا کرنے والے نہیں۔"

"اُس کی لاش کہاں پھینکی ہے؟" — میں نے کہا — "لڑکے کو یہاں تک زندہ لایا گیا تھا۔ جب تم لوگوں نے خطرہ دیکھا تو اُسے قتل کر کے لاش غائب کر دی۔ میں ثابت کر دوں گا کہ تم نے اُسے قتل کر دیا ہے۔"

میں نے انہیں باہر بھیج کر ایک کانسٹیبل کو اندر بلایا اور [illegible]

دریچے کے ڈنڈے توڑ دے۔ میں خود باہر آ گیا اور ان تینوں کو کوٹھڑی سے دُور لے گیا۔ قاضی کی حالت بہت ہی بُری ہو رہی تھی۔ میں اب ایک ہی بات کہتا تھا کہ تم نے لڑکے کو قتل کر دیا ہے۔

سپاہی کھڑکی کے ڈنڈے توڑ آیا تو میں سب کو تھانے لے جانے لگا۔

ہیڈ کانسٹیبل میرے ساتھ تھا۔ اُسے کہا کہ انہیں تھانے لے جاتے ہیں کوٹھڑی کو تالا لگا کر اختر کے گھر کو چل دیا۔ صبح کی اذان میں تھوڑا سا وقت رہ گیا تھا۔ میں اختر کے گھر گیا۔ دروازہ اُس کی ماں نے کھولا۔ اختر گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ میں نے اُسے جگا کر بتایا کہ وہ اب یہ بیان دے کہ اُس نے خود اپنے ہاتھ کھول لئے تھے پھر اپنے پاؤں کھولے، مُنہ اور آنکھوں کے کپڑے کھولے۔ اُٹھ کر دیکھا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ ایک کھڑکی تھی جس میں چار ڈنڈے لگے ہوتے تھے۔ وہ توڑ لئے اور نکل آیا۔

اس طرح میں نے قاضی کی بیٹی مقصودہ کو محفوظ کر دیا۔ اس کی گواہی کی ضرورت ہی نہ رہی۔ اس لڑکی نے اپنے باپ اور بھائیوں کو بچانا چاہا تھا لیکن اُسے معلوم نہ تھا کہ یہ جُرم چھپ نہیں سکے گا۔

میں نے تینوں ملزموں کو جگائے رکھا تھا۔ اب اُن کا جُرم پکڑا گیا تھا۔ اُن کے دماغ ان کے قبضے میں نہیں رہے تھے۔ میں انہیں کہہ رہا تھا کہ میں انہیں ۳۰۲ (قتل) کے جُرم میں گرفتار کر رہا ہوں۔ اس سے مجھے یہ فائدہ ملا کہ تینوں نے اقبالی بیان دے دیئے۔ معلوم ہُوا کہ ان کا چچازاد گھر سے بھاگ گیا ہے۔

"کیا تم لڑکے کو قتل کرنا چاہتے تھے؟" —— میں نے پوچھا۔

"نہیں جی!" —— بڑے بھائی نے جواب دیا —— "اُسے سبق سکھانا تھا کہ ہمارے ساتھ جو ٹکر لے گا اُس کا ہم یہ حال کر دیں گے۔ اُس سے توبہ کرا کے چھوڑ دینا تھا۔"

میں نے اگلے روز ان کے بیان ایک مجسٹریٹ کے آگے پیش کر کے دفعہ ۱۶۴ کے تحت قلمبند کرا لئے۔ ان کا چچازاد چوتھے پانچویں دن گرفتار ہُوا

تھا۔ میں نے چابی کی برآمدگی اور کوٹھڑی سے رسیوں اور کپڑوں کی برآمدگی کے مشیرنامے بعد میں تحریر کئے اور دو مشیروں کے دستخط لئے تھے۔ یہ میں نے دھاندلی کی تھی۔ مجھے شہادت پوری کرنے کے لئے کچھ اور چکر بھی چلانے پڑے تھے۔

قاضی عبدالمنان کو اعانتِ جُرم میں چھ ماہ سزا ہُوئی۔ باقی تینوں کو دو دو سال قید اور دو دو ہزار روپیہ جرمانہ ہُوا۔ عدم ادائیگی جرمانہ چھ چھ ماہ مزید قید سنائی گئی۔

مقدمے کے دوران ہی اختر اور عصمت کی شادی ہو گئی تھی۔

وہ اغوا کرنے آئے تھے

میں نے اس کتاب میں آپ کو ایک کہانی سنائی ہے جس کا عنوان ہے "ساس، سوتیلی ماں اور سسر سول"۔ میں نے کسی کے بھی خلاف مقدمہ نہیں بنایا تھا۔ میں نے پوری کوشش کی تھی کہ ان دونوں خاندانوں کی دشمنی ختم ہو جاتے لیکن مجھے توقع نہیں تھی کہ ایسا ہو سکے گا۔ اگر آپ نے خاندانوں کی دشمنیاں دیکھی ہیں تو آپ نے غور کیا ہوگا کہ ایک دوسرے کے دشمن خاندان ذرا ذرا سی بات کو بڑھا چڑھا کر ایک دوسرے کے خلاف طوفان کھڑا کر دیتے ہیں۔ کوئی بات نہ ملے تو بات بنا لیتے ہیں۔ میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں اُس وقت تو دشمن خاندانوں میں صبر اور تحمل بالکل ہی نہیں ہوتا تھا۔ اتنا بڑا واقعہ ہو گیا تھا پھر یہ لوگ دشمنی کس طرح ختم کر دیتے۔

ذرا غور کریں کہ ایک لڑکی نے اپنے باپ کے تین بیلوں کو زہر دے دیا تھا اور اس واردات کے پیچھے لڑکی کے سسرال کا ہاتھ تھا۔ یہ ہر کسی کو پتہ چل گیا تھا کہ راجہ مراد خان کی دوسری بیوی شاداں کے قابلِ اعتراض تعلقات گاؤں کے ایک آدمی کے ساتھ تھے جس کا نام نذیر تھا۔ مراد خان کا ایک بیٹا بھی تھا جس کا نام جمال تھا۔ جو لوگ ذرا سی بات بھی برداشت نہیں کرتے تھے وہ تین بیلوں کا خون اور اپنی بے عزتی کیسے برداشت کر لیتے۔ مجھے یہی توقع تھی کہ کسی نہ کسی بات پر ان لوگوں میں لاٹھیاں اور کلہاڑیاں چل جائیں گی۔ میں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ اگر ایسی بات ہوتی تو میں ان کی عورتوں کو بھی کیس میں شامل کر کے سزا دلاؤں گا، لیکن بڑی سنگین واردات ہو گئی ——

نذیر قتل ہو گیا۔

صبح ابھی سورج طلوع نہیں ہُوا تھا جب نمبردار، مقتول نذیر کا باپ اور شاید اس کے ایک دو چچے تھانے میں آ گئے۔ میں ابھی گھر میں تھا۔ ایک کانسٹیبل نے مجھے آکر بتایا کہ ڈیڑھ دو مہینے پہلے آپ نے جو کیس رفع دفع کر دیا تھا اُس کا ایک آدمی قتل ہو گیا ہے۔

"مقتول کا نام کیا بتاتے ہیں؟" — میں نے کانسٹیبل سے پوچھا۔

"شاید نذیر بتاتے ہیں" — کانسٹیبل نے جواب دیا — "میرا خیال ہے یہ وہی آدمی ہے جس کے ساتھ مراد خان کی بیوی نے یاری لگا رکھی تھی۔"

یہ سُن کر ایک تو میں غصے سے بھڑک اُٹھا اور دوسرے مجھے یہ اطمینان ہُوا کہ یہ لمبی چوڑی تفتیش یا سراغرسانی کی واردات نہیں۔ نذیر کو مراد خان یا اُس کے بیٹے جمال خان نے یا دونوں نے قتل کیا یا کرایا ہے۔ پہلے واقعہ کو، جہاں تک مجھے یاد ہے ایک مہینہ یا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ مہینہ گزرا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے بیوقوف بنانے کے لئے انتقام لینے میں اتنا وقت گزار دیا تھا۔

میں جلدی جلدی تیار ہو کر تھانے گیا۔ رپورٹ دینے جو آئے ہوئے تھے اُن سب نے مجھے السلام علیکم کہا اور میں نے اس کے جواب میں جتنی گالیاں یاد تھیں سُنا ڈالیں۔

"اپنے بیٹے کو کس سے مروایا ہے؟" — میں نے مقتول کے باپ سے پوچھا۔

"قاتل وہی ہیں ملک صاحب!" — نذیر کے باپ نے روتے ہوئے کہا — "مراد خان اور اُس کا بیٹا جمال خان۔"

"حضور!" — نمبردار بولا — "وجہ تو آپ کو معلوم ہے۔"

میں نے نمبردار کو ایک خاص قسم کی گالی دے کر کہا کہ مجھے اور بھی بہت کچھ معلوم ہے۔ میرے پوچھنے پر اُنہوں نے بتایا کہ لاش ان کے گاؤں سے دو اڑھائی فرلانگ دُور ایک گہری سی جگہ پر پڑی ہوتی ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق مقتول کو کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے قتل کیا گیا تھا۔

ایسی رپورٹ پر جو کاغذی کارروائی اور رپورٹ دینے والے سے جو پوچھ گچھ کرنی ہوتی ہے وہ میں نے کی۔ اس سلسلے کا کچھ کام محرر ہیڈ کانسٹیبل کے سپرد کیا اور میں موقعہ واردات کو چل پڑا۔ میں بڑی تیزی سے وہاں تک پہنچا۔ مجھے خطرہ یہ نظر آ رہا تھا کہ تماشائی اور مقتول کے رشتہ دار کھُرے مٹا دیں گے۔ کھوجی کی طرف میں نے ایک کانسٹیبل کو بھیج دیا تھا۔

میں نے جب زمین پر خون میں لت پت لاش کو پڑے دیکھا تو اُس پر جھکا۔ لاش پیٹھ کے بل پڑی تھی۔ مجھے محسوس ہُوا کہ لاش کے سینے سے قمیض ہلی ہے۔ فوراً ہی خیال آیا کہ ہوا سے ہلی ہو گی۔ میں لاش کے سر کو دیکھنے لگا تو اُس کے مُنہ سے سیٹی کی طرح کی آواز نکلی۔ اُس وقت میں نے اُس کے سینے پر نظر ڈالی تو سینہ سانس لینے کی طرح اُٹھتا اور بیٹھتا تھا۔ سینے کی یہ حرکت بڑی معمولی سی تھی۔ میں نے اُس کی نبض پر انگلی رکھی تو میں حیران رہ گیا کہ نبض چل رہی تھی۔ دل پر ہاتھ رکھا تو دل دھڑک رہا تھا۔ میں اُٹھ کھڑا ہُوا اور ان لوگوں کو جو تھانے میں میرے پاس آئے تھے وہی گالیاں جو میں انہیں پہلے دے چکا تھا ایک بار پھر دیں اور کہا کہ یہ تو زندہ ہے۔

"بدبختو!" — میں نے انہیں کہا — "اگر اچھی طرح دیکھ لیتے تو تم اسے ساتھ ہی اُٹھا لاتے اور اسے ہسپتال بھیج دیا جاتا۔ اب اس کا خون اتنا جا چکا ہے کہ معلوم نہیں یہ زندہ بھی رہے گا یا نہیں۔ فوراً چارپائی لاؤ اور اسے ہسپتال پہنچاؤ۔"

مجھے مضروب کے ساتھ ایسی کوئی ہمدردی نہیں تھی کہ وہ ضرور ہی زندہ رہے۔ میری ضرورت صرف یہ تھی کہ اگر اُس نے مرنا ہی ہے تو بیان دے کر مرے۔ اُس کے لواحقین دوڑے گئے اور چارپائی اُٹھا لاتے۔ میں نے چارپائی آنے تک مقتول کے جسم کا معائنہ کر لیا اور جیسی ضربات تھیں وہ لکھ لیں۔ زخم الگ الگ لکھے۔ اندازاً اُن کی لمبائی گہرائی وغیرہ بھی لکھ لی۔ جہاں وہ پڑا تھا وہاں سے کم و بیش دس گز دُور ایک لاٹھی پڑی تھی جو اسی کی ہو سکتی تھی۔

ان لوگوں نے مجھ پر یہ احسان کیا تھا کہ زیادہ لوگوں کو بیہوش مضروب کے قریب نہیں آنے دیا تھا۔ میں نے لاٹھی اٹھائی اور زمین دیکھی۔ یہ کسی کا کھیت تھا جس میں کچھ بھی کاشت نہیں کیا گیا تھا۔ مجھے پاؤں کے ایسے نشان نظر آتے

جیسے دو یا دو سے زیادہ آدمیوں میں لڑائی ہوئی ہو۔ میں زمین کو گھوم پھر کر دیکھ رہا تھا کہ ایک آدمی نے مجھے آواز دی۔ وہ ایک طرف اشارہ کر رہا تھا۔ میں اس تک پہنچا۔

"جناب!" —— اُس نے کہا —— "وہ دیکھیں نیچے زری جُوتی کا ایک پاؤں پڑا ہُوا ہے"۔

میں نیچے گیا۔ یہ جگہ موقعۂ واردات والی جگہ سے ذرا نیچے تھی۔ یہ بھی ایک خالی کھیت تھا جس کی مٹی خاصی نرم تھی۔ میں نے جُوتی تک پہنچنے سے پہلے اس کا کھُرا دیکھنے کی کوشش کی۔ مجھے اس جُوتی کا کھُرا نظر آگیا۔ وہاں مٹی نرم تھی۔ اُس کھُرے کا رُخ بتا رہا تھا کہ یہ کوئی عورت تھی اور موقعہ سے بھاگ کر گئی تھی۔ پاؤں چھوٹا تھا جس سے میں نے کہا کہ یہ زنانہ پاؤں ہے۔ میں نے جُوتی دیکھی۔ یہ زری جُوتی تھی جو بالکل نئی تو نہیں تھی لیکن پرانی بھی نہیں تھی۔ آگے دیکھا تو مجھے یہ کھُرا اس طرح نظر آیا کہ ایک پاؤں جُوتی کا اور دوسرا پاؤں ننگا تھا۔ چند قدم ہی آگے اس جُوتی کا دوسرا پاؤں پڑا تھا۔ کھُرا اُٹھانا کھوجی کا کام تھا۔ میں نے دو آدمیوں کو بلا کر وہاں کھڑا کر دیا کہ وہ کسی کو اس طرف سے نہ گزرنے دیں۔

اگر مضروب کی حالت کچھ اچھی ہوتی تو میں تفتیش کے اتنے گھیرے چکر میں نہ پڑتا لیکن مجھے اُس کے بچنے کی امید کم ہی نظر آرہی تھی۔ میں واپس موقعہ پر آیا۔ چارپائی آچکی تھی۔ میں نے انہیں کہا کہ اس کے زخموں پر کپڑے باندھ دو تاکہ جو خون اس کے اندر رہ گیا ہے وہ اندر ہی رہے۔ میں نے اُس کے جسم کا معائنہ کیا تھا۔ تین یا چار ضربیں لاٹھیوں کی سر پر پڑی تھیں۔ ایک ضرب سے خون پھُوٹا تھا۔ باقی ضربوں کی جگہ اُبھار تھے۔ کلہاڑی کا زخم ایک کندھے پر تھا اور دو زخم کندھے سے نیچے ایک بازو پر تھے۔ اس نے وار روکنے کے لئے بازو آگے کئے ہوں گے۔

میں نے ان لوگوں سے کہا کہ اسے چارپائی پر ڈالیں اور جس قدر جلدی ہو سکے اسے ہسپتال پہنچائیں۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو یہ کہہ کر ساتھ بھیج دیا کہ ڈاکٹر اس کا نزعی بیان لینے کی کوشش کرے۔

طلاق اور زری جُوتی

کھوجی آگیا تھا۔ میں نے اُسے جُوتی کے دونوں پاؤں دے کر بتایا کہ اُس کے کھُرے کہاں ہیں۔ پھر میں وہاں سے نمبردار کی ڈیوڑھی میں جا بیٹھا اور سب سے پہلے مراد خان، اُس کے بیٹے اور شاداں کو بُلایا۔ مراد خان آیا تو میں نے اُسے اندر بلا لیا۔

"جناب راجہ صاحب!" —— میں نے اُسے کہا —— "جتنی جلدی مان جاؤ گے تمہارے لئے اتنا ہی بہتر ہوگا"۔

"کیا مان جاؤں ملک صاحب!" —— مراد خان نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مراد خان!" —— میں نے کہا —— "میری بات سمجھ جاؤ۔ نذیر کو تم نے قتل کروانے کی کوشش کی ہے۔ تم نے نہیں تو پھر یہ تمہارے بیٹے کا کام ہے ...... میں نے جس طرح پہلے تم لوگوں کو بخش دیا تھا اب بھی چھوڑ سکتا ہوں۔ نذیر مرا نہیں زندہ ہے"۔

"لیکن ملک صاحب!" —— مراد خان نے کہا —— "میرے پاس اس ذلیل آدمی کو قتل کرنے کی کوئی وجہ نہیں"۔

"کیا تمہاری بیوی کے ساتھ اُس کا یارانہ نہیں تھا؟" —— میں نے پوچھا۔

"وہ تو جس روز پتہ چلا تھا ملک صاحب!" —— مراد خان نے کہا۔ —— "اُس سے دو روز بعد میں نے اس بدکار لڑکی کو طلاق دے دی تھی۔ اگر قتل ہی کرنا تھا تو میں اس خوبصورت چڑیل کو قتل کرتا جس نے مجھے دھوکہ دیا تھا لیکن میں نے قتل کی سوچی ہی نہیں تھی کیونکہ ہم سب نے آپ کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ دشمنی عداوت ختم کر دیں گے۔ اگر قتل کرنا ہوتا تو میں اتنا لمبا انتظار نہ کرتا"۔

"باہر جا کر بیٹھو" —— میں نے کہا —— "اور ٹھنڈے دل سے سوچو۔ پھر مجھے بتاؤ۔ اگر پھانسی چڑھنا ہے تو بھی بتا دینا"۔

اُسے باہر بھیج کر میں نے اُس کے بیٹے جمال خان کو بلایا۔ اُس سے بھی یہی کچھ پوچھا اور اُس نے بھی اپنے باپ جیسے جواب دیے۔

"اگر میں نے قتل کرنا ہوتا تو اپنے باپ کو قتل کرتا" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "اصل قصور وار میرا باپ ہے۔ اس بڑھاپے میں اُس نے جوان لڑکی کے ساتھ شادی کر لی اور اپنی بیٹی کو اس بیوی کو خوش کرنے کے لئے دشمنوں کے گھر بیاہ دیا..... سچی بات یہ ہے ملک صاحب، کہ میں نے باپ کے ساتھ تعلق ہی توڑ لیا تھا۔ اس شخص نے سارے خاندان کی اور اپنی ذات کی بے عزتی کرائی ہے"۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "میں اپنی قسم کھا سکتا ہوں"۔

"کیا تمہیں یہ شک نہیں کہ نذیر پر یہ قاتلانہ حملہ تمہارے باپ نے کرایا ہے؟"

"جمال بھائی!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "تھانیدار قسموں کو نہیں مانا کرتے۔ اگر یہ کام تمہارا ہے تو بے خوف ہو کر بتا دو۔ تم نے دیکھا ہے کہ میں نے تین بیلوں کی زہر خورانی کی واردات کاغذوں میں دبا دی ہے۔ نذیر زندہ ہے۔ یہ ۳۰۲ کا کیس نہیں بنے گا۔ بتا دو اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ مقدمہ نہیں بناؤں گا"۔

اُس نے مجھے یقین دلانے کی بہت کوشش کی کہ اُس کا اِس واردات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ میں نے اُس پر مزید زور نہ دیا کہ وہ جرم کا اقبال کر لے۔ یہ میرا اپنا طریقہ تفتیش تھا۔ میں مشتبہوں کو ابھی سونگھ رہا تھا۔ پختہ شک انہی پر تھا لیکن اُن کی یہ بات بھی قابلِ غور تھی کہ یہ قتل جیسی سنگین واردات کرنا چاہتے تو بہت پہلے کر چکے ہوتے۔ ایسے قتل فوری اشتعال کے تحت فوراً ہو جاتے ہیں اور ایسے قتل اس وجہ سے کئے جاتے ہیں کہ لوگ بے غیرت نہ کہیں۔ میں ان لوگوں کی نفسیات دیکھ رہا تھا۔

زری جُوتی ایک ثبوت تھا کہ اس واردات میں ایک عورت بھی موجود تھی۔ یہ شاداں ہی ہو سکتی تھی کیونکہ نذیر کے مراسم شاداں کے ساتھ چل رہے تھے۔ میں نے شاداں کو بھی بلایا ہُوا تھا۔ اُس کے ساتھ بات کرنے سے پہلے مجھے یہ خیال آیا کہ نذیر کے ساتھ کسی اور عورت کے تعلقات بھی ہو سکتے ہیں۔ ہو سکتا تھا کہ اس عورت کے خاوند یا گھر کے مردوں نے انہیں موقعہ پر پکڑ لیا ہو۔ عورت بھاگ گئی اور نذیر مارا گیا۔

میں نے جمال خان کو باہر بیٹھنے کو کہا اور شاداں کو اندر بلایا۔ اُس نے پہلی حرکت یہ کی ڈیوڑھی کا دروازہ جو میں نے کھلا رکھا تھا اُس نے بند کر دیا اور اس طرح مسکراتی ہوئی میرے پاس آکر بیٹھ گئی جیسے میں نے اُسے اپنا دل پشوری کرنے کے لئے بلایا ہو۔ اُس کے چہرے پر ذرا سی بھی گھبراہٹ نہیں تھی نہ ڈر کے آثار تھے۔

"آپ نے میرے ساتھ وعدہ کیا کیا تھا" ـــــ اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ـــــ "اور مجھے آپ سارے شہر میں بدنام کر کے غائب ہو گئے"۔

"شاداں! میرے سامنے بیٹھو" ـــــ میں نے غصے پر بڑی مشکل سے قابو پا کر کہا ـــــ "اِدھر مجھے کہتی ہو کہ میں تمہارے ساتھ شادی کر لوں اُدھر تم نے نذیر کے ساتھ دوستی قائم رکھی ہوئی ہے"۔

"نہیں جی!" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "یہ آپ کو کس لے بتایا ہے؟"

"نذیر کے ساتھ کون تھی؟" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "کیا وہ تم نہیں تھیں؟"

"کہاں؟" ـــــ اُس نے حیران ہو کر پوچھا ـــــ "میں اُس کے ساتھ کہاں تھی؟"

"جہاں وہ بدکار بے ہوش پڑا ہُوا تھا" ـــــ میں نے غصے کے لہجے میں کہا ـــــ "دیکھ شاداں! جس طرح تُو نے پہلے سچ بولا تھا اسی طرح اب بھی سچ بتا دے۔ میں تجھ پر یہ شک تو نہیں کرتا کہ اُسے تُو نے مارا ہے۔ مجھے یہ بتا دے وہ کون تھے"۔

"سچ تو بتا رہی ہوں تھانیدار جی!" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "میں نے اُس کے ساتھ تعلق توڑ لیا تھا"۔

"کب توڑا تھا؟" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "کیوں توڑا تھا؟"

"اتنی بے عزتی اور بدنامی کے بعد میں اُس کے ساتھ کیسے تعلق قائم رکھ سکتی تھی؟" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "ماں نے مجھ پر پہرہ لگا دیا تھا۔ اُدھر سے طلاق بھی مل گئی۔ آپ گاؤں میں کسی سے پوچھ لیں۔ میں تو گھر میں قید ہو گئی تھی"۔

"تمہارے پاس زری جُوتی ہے؟"

اُس نے میرے مُنہ پر نظریں جما دیں۔ اس سے مجھے شک ہُوا کہ یہ

جُوتی اسی کی ہے۔

"میرے پاس کوئی زری جُوتی نہیں" ـــ شاداں نے جواب دیا۔

"پھر تم نے جھوٹ بولا" ـــ میں نے کہا اور زری جُوتی اُس کے آگے پھینک دی ـــ "یہ پہنو"۔

اُس نے فوراً اپنی جُوتی اُتار کر پاؤں زری جُوتی میں ڈال لئے۔ میرے کہنے پر وہ کھڑی ہوگئی۔ میں نے اُٹھ کر اور اُس کے پاؤں کے قریب بیٹھ کر دیکھا جُوتی تقریباً ایک انگلی کھُلی تھی۔

"اتنی کھُلی جُوتی میں کیسے پہن سکتی ہوں!"

اُس کھیت میں جہاں سے یہ جُوتی ملی تھی، ننگے پاؤں کے کھُرے بھی تھے۔ میں نے کھوجی کا پتہ کرایا۔ مجھے بتایا گیا کہ کھوجی اپنا کام کر کے ابھی ابھی واپس آیا ہے۔ میں نے اُسے اندر بلا کر شاداں کے سامنے کہا کہ اس کا کھُرا دیکھو۔ کھوجی باہر چلا گیا اور باریک مٹی اُٹھا کر لے آیا۔ اُس نے یہ مٹی فرش پر رکھ کر پھیلا دی اور شاداں کا ایک پاؤں اس پر رکھوایا۔ کھوجی نے مجھے اشارہ کیا کہ اس لڑکی کو باہر بھیج دو۔ میرے کہنے پر شاداں باہر چلی گئی۔

"کھُرا ملتا جُلتا ہے" ـــ کھوجی نے کہا ـــ "اگر میں یہ کہوں کہ وہاں یہی کھُرا تھا تو غلط نہیں ہوگا، لیکن حضور! تھوڑا گہرائی میں جائیں تو شک ہوتا ہے۔ کھیت کی مٹی نرم ہے اور اس میں ہل کی لکیریں ہیں یعنی سیاڑ ہیں۔ عورت دوڑ رہی تھی۔ آپ غور کریں کہ دوڑتا ہُوا پاؤں جب زمین پر لگ کر اُٹھتا ہے تو ایڑی اُٹھتی ہے اور پنجہ ذرا پیچھے کو ہو کر اوپر اُٹھتا ہے۔ اس طرح کھُرا پوری طرح واضح نہیں ہوتا"۔

میں نے آپ کو اپنی کہانیوں میں کھوجیوں کے متعلق بہت کچھ بتایا ہے۔ یہ لوگ اَن پڑھ ہوتے تھے لیکن ان کا فن ایک سائنس کی حیثیت رکھتا تھا۔ ان میں بعض ایسے ایسے ماہر بھی تھے کہ کھُرا دیکھ کر پورے وثوق سے بتا دیا کرتے تھے کہ یہ عورت کا کھُرا ہے اور عورت کے پیٹ میں بچہ ہے۔ پولیس تو کھُرے کا مولڈ تیار کرتی تھی لیکن کھوجی مختلف کھُروں کو ذہن میں محفوظ رکھتے تھے۔

یہ کھوجی مجھے کھُروں کی شناخت کی گہرائی میں لے جا کر سمجھا رہا تھا کہ یہ کا بھی ہو سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔ یعنی جہاں تک شاداں کا تعلق مشکوک تھا۔

"میری ایک عرض مانیں" ـــ کھوجی نے کہا ـــ "اس لڑکی کو شاملِ تفتیش رکھیں بلکہ مُشتبہوں میں رکھیں"۔

اسے شاملِ تفتیش تو رکھنا ہی تھا کیونکہ اس واردات کا باعث یہی لڑکی معلوم ہوتی تھی لیکن میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ کھُرا کوئی ایسی شہادت نہیں تھی جس پر میں مقدمے کی عمارت کھڑی کر سکتا۔ مجھے تو بڑی ٹھوس شہادت کی ضرورت تھی۔ میں نے کھوجی کو بتایا کہ یہ جُوتی اس لڑکی کی نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ تو پوری ایک اُنگل کھُلی ہے۔

میں بے چین ہوگیا

میرے ذہن پر نذیر سوار تھا۔ میں اس انتظار میں بے چین ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر کی رپورٹ آئے کہ مضروب ہوش میں آگیا ہے اور بیان دینے کے قابل ہے۔ رپورٹ آجانے کی صورت میں میرا کام بڑا آسان ہو جاتا اور تفتیش کا رُخ ہی بدل جاتا۔ میں تفتیش یہ سوچ کر کر رہا تھا کہ مضروب مر گیا تو بھی مجھے یہ تفتیش کرنی تھی۔ میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے نمبردار کو بلایا۔

"یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ شاداں اور نذیر کے تعلقات تھے"۔

"ہاں حضور!" ـــ نمبردار نے جواب دیا ـــ "یہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں تھی"۔

"طلاق کے بعد بھی ان کی میل ملاقات چلتی رہی؟" ـــ میں نے پوچھا اور کہا ـــ "تم جانتے ہو کہ موقعہ پر ایک عورت کے کھُرے پائے گئے ہیں اور یہ جُوتی وہاں سے ملی ہے۔ کیا تم شک نہیں کرو گے کہ یہ عورت شاداں کے سوا اور کون ہو سکتی ہے؟"

"نہیں جناب!" — نمبردار نے کہا — "شاداں اب اتنی جرأت نہیں کر سکتی کہ وہ پہلے کی طرح وہی چکر چلاتے رکھے۔ طلاق نے اُس کا اور اُس کی ماں کا دماغ درست کر دیا ہے۔ میں نے بھی دونوں کو جوتے تو نہیں مارے لیکن بے عزتی بہت کی اور کہا کہ تمہیں اپنی عزت کا خیال نہیں تو اپنی ذات برادری کی عزت کا خیال کرو۔ مجھے پورا یقین ہے کہ شاداں نذیر کے ساتھ نہیں گئی تھی۔"

"پھر یہ پتہ چلاؤ" — میں نے کہا — "کہ نذیر کا دوستانہ اور کس عورت کے ساتھ تھا۔"

"نذیر بدمعاش آدمی ہے" — نمبردار نے جواب دیا — "اُس کی بیوی شریف عورت ہے۔ بے چاری چُپ چاپ زندگی گزار رہی ہے اور نذیر نے اپنے یارانے لگاتے ہوتے ہیں۔"

"میں کہتا ہوں پتہ کرو کہ ان دنوں اُس کا دوستانہ کس کے تھا" — میں نے جھنجھلا کر کہا — "اٹھو اور جاؤ اور کچھ کام کر کے دکھاؤ .... اور ایسے کرنا کہ کھوجی کو میرے پاس بھیج دینا۔"

کھوجی آ گیا۔ میں نے اُس سے رپورٹ لینی تھی کہ اُس نے کوئی اور کھُرے دیکھے ہیں یا نہیں۔ ایک تو اُس نے یہ کھُرا بتایا جو کسی عورت کا تھا۔ یہ کھُرا کچھ دُور تک چلا گیا تھا۔ اس کا رُخ کسی گاؤں کی طرف ہونا لازمی تھا۔ کھوجی نے وثوق سے کہا کہ یہ کھُرا نذیر اور شاداں وغیرہ کے گاؤں کی طرف نہیں آیا۔ حقیقت یہ تھی کہ کچھ دُور جا کر غائب ہو گیا تھا۔ غائب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں اور مویشیوں نے کھُرا ہضم کر لیا تھا۔ اس سے یہ شک بھی ہوتا تھا کہ یہ عورت اس گاؤں کی نہیں تھی۔

کھوجی نے بتایا کہ ملزم تین ہو سکتے ہیں۔ چار ہو سکتے ہیں۔ دو نہیں ہو سکتے۔ اُس کی رپورٹ کے مطابق موقعۂ واردات پر لڑائی ہوئی۔ ان میں سے ایک مردانہ کھُرا اُس گاؤں کی طرف چلا گیا جہاں مراد خان کی بیٹی عابدہ بیاہی ہوئی تھی۔ یہ کھُرا تین چار خالی کھیتوں میں ملا۔ آگے پگڈنڈی آ گئی اور کھُرا غائب ہو گیا۔ اُس کا رُخ یقینی طور پر عابدہ کے سسرال والے گاؤں کی طرف تھا۔ باقی

ملزموں کے کھُروں کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ باقی ملزم کہیں اور سے آئے تھے۔

کھوجی نے بتایا کہ موقعۂ واردات سے ایک مردانہ کھُرا اور چلا۔ وہ ایک طرف سے عابدہ کے سسرالی گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ کھوجی کو یقین تھا کہ یہ بھی ایک ملزم کا کھُرا ہے۔ میں آپ کو کھُروں کی بات بڑے اختصار سے سُنا رہا ہوں۔ اگر میں کھوجیوں کی سائنس اور اُن کی اصطلاحوں میں بات کروں تو یہ بڑی دلچسپ ہو جاتی ہے بلکہ حیران کُن بھی ہو جاتی ہے لیکن میں کہانی کو طول نہیں دینا چاہتا۔

آج کل دیہات کی عورتیں بھی شہروں میں آ کر نئے نمونے کی جوتیاں اور سینڈل وغیرہ خریدتی ہیں۔ اُس وقت دیہات میں اور قصبوں میں بھی یہ رواج تھا کہ ایک موچی گاؤں کی عورتوں کی جوتیاں بنایا کرتا تھا۔ اُس وقت کے موچی جوتیاں تیار کر کے دکانوں کی طرح رکھتے نہیں تھے بلکہ وہ یاد رکھتے تھے کہ فلاں عورت یا مرد کو جوتی دیئے اتنا عرصہ ہو گیا ہے اور اب اُس کے لئے نئی جوتی بننی چاہیے۔ سائز انہیں یاد ہوتے تھے۔ دیہات میں اکثر گھروں سے جوتیوں کی قیمت اناج اور دالوں کی صورت میں ملتی تھی اور دونوں عیدوں پر انہیں کچھ پیسے عیدی کے طور پر مل جاتے تھے۔

میں نے نمبردار کو بلایا اور اُسے کہا کہ گاؤں کے موچی کو اپنے ساتھ لے آؤ۔ وہ گیا اور ایک موچی کو لے آیا۔ مجھے بتایا کہ سارے گاؤں کی جوتیاں یہ موچی اور اس کا ایک بیٹا بناتا ہے۔ میں نے زری جوتی اُس کے آگے رکھ کر پوچھا کہ یہ اُسی نے بنائی ہے اور اگر اُس نے بنائی ہے تو کس کے لئے بنائی تھی؟

"اس قسم کی جوتیوں کے تین جوڑے بناتے تھے" — موچی نے جواب دیا۔

میرے پوچھنے پر اُس نے جن تین عورتوں کے نام لئے اُن میں شاداں کا نام بھی تھا۔ یہ سُن کر میرے دماغ میں کچھ روشنی آ گئی۔ میں نے موچی کو اُٹھا دیا اور اُسے کہا کہ شاداں کو اندر بھیج دے۔

صرف ایک گناہ!

نمبردار اُٹھ کر باہر جانے لگا تو میں نے اُسے روک لیا۔ شاداں آگئی۔

"تم جھوٹ بولنے سے باز نہیں آؤ گی شاداں!" — میں نے کہا اور ساتھ ہی میں نے نمبردار سے کہا — "تم ہی اس لڑکی کو کچھ سمجھاؤ۔ میں اسے کہہ چکا ہوں کہ نذیر کو اُس نے نہیں مارا لیکن یہ ڈرتی بولتی نہیں۔"

"بتا دے شاداں، بتا دے" — نمبردار نے کہا — "ملک صاحب بڑے دل گُردے والے آدمی ہیں۔ میں تمہارے ساتھ وعدہ کرتا ہوں کہ ایسی ویسی ہو گئی تو میں تم پر حرف نہیں آنے دوں گا۔"

"میرے ایک گناہ کے پیچھے آپ سارے گناہ میرے مُنہ پر کیوں ملتے جا رہے ہیں؟" — شاداں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا — "میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ میں نذیر کے ساتھ نہیں تھی۔"

"میں یقین کر لوں گا" — میں نے کہا — "صرف اتنا سا کام کر دو کہ دو تین مہینے پہلے اس سوچی سے جس نے ابھی تمہیں اندر بھیجا ہے، تم نے جو زری جُوتی بنوائی تھی وہ گھر سے لا کر مجھے دکھا دو۔"

"وہ جُوتی" — شاداں نے کہا اور چُپ ہو کر سوچنے لگی۔ پھر اس طرح بولی جیسے اُسے کچھ یاد آ گیا ہو — "وہ جُوتی میری ماں نے پہنی تھی..."

"اچھا اچھا وہ زری جُوتی!" — نمبردار بول پڑا — "وہ جو تمہاری ماں گھر گھر پوچھتی پھرتی تھی کہ شادی پر پہن کر گئی اور کسی نے اُٹھا لی۔"

میں غصے سے پھٹ پڑا۔ نمبردار کو دخل نہیں دینا چاہیے تھا۔ میں لڑکی سے تفتیش کر رہا تھا۔ لڑکی نے اُس کی بات سُنتے ہی کہا — "ہاں ہاں وہی جُوتی" — میں نے نمبردار کو ایک دو گالیاں دے کر اُٹھا دیا اور باہر نکال دیا۔

"تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارے پاس کوئی زری جُوتی نہیں" — میں

نے کہا — "تم نے یہ جھوٹ کیوں بولا تھا؟"

"تو میرے پاس جُوتی ہے کہاں!" — شاداں نے کہا — "میں نے یہ بتانا ضروری نہ سمجھا کہ جُوتی چوری ہو گئی ہے" — شاداں ہارے ہوئے سے انداز میں میرے سامنے فرش پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ میرے زانو پر رکھ کر بولی — "آپ مجھے کیوں تنگ کرتے ہیں؟ میں تو آپ کی بیوی بننے کو تیار ہوں۔ بیوی نہ بنائیں ویسے ہی سہی" — اور اس کے ساتھ ہی اُس کے آنسو بہنے لگے۔

میں نرم دل آدمی تھا البتہ مشتبہوں اور ملزموں کے لئے اور خاص طور پر اس قسم کی عورتوں کے لئے بڑا مضبوط پتھر تھا لیکن شاداں کے انداز نے اور اُس کے آنسوؤں نے مجھے کافی حد تک متاثر کر لیا۔ اگر وہ ایکٹنگ کر رہی تھی تو یہ کامیاب ایکٹنگ تھی۔ میں نے اُس پر جو شک کیا تھا اسے پوری طرح ذہن سے نہ اتارا اور شاداں کو شاملِ تفتیش ہی رکھا لیکن میرا شک کچھ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔

شاداں کی ماں سے شاداں کے جھوٹ اور سچ کا پتہ چلانا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے شاداں سے کہا کہ وہ اطمینان سے باہر بیٹھے لیکن وہ اُٹھنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ کبھی اظہارِ محبت شروع کر دیتی کبھی اپنی بے گناہی ثابت کرنے لگتی۔ میں اسے اٹھانے کی کوشش کرتا تھا اور وہ مجھے بڑے خوبصورت جال میں پھانس رہی تھی۔

"تھانیدار جی!" — اُس نے کہا — "میری محبت کو ٹھوکر مار کر سُکھی نہیں رہو گے۔"

"اگر تمہیں مجھ سے محبت ہوتی تو میرے آگے جھوٹ نہ بولتیں" — میں نے کہا۔

اُس نے میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور جذباتی اور عشقیہ باتوں پر اُتر آئی۔ بڑی مشکل سے اُسے باہر نکالا۔ ایک کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ شاداں کی ماں کو ساتھ لے آئے۔

شاداں کی ماں آگئی۔ وہ شاداں کی طرح ہی خوبصورت عورت تھی۔ اگر اس نے آج کل کی عورتوں کی طرح میک اَپ کر رکھا ہوتا تو وہ شاداں کی ہم عمر لگتی، لیکن اُس کے حسن میں معصومیت کی ذرا سی بھی جھلک نہیں تھی۔ اس قسم کے چہروں کو پولیس والے خوب پہچانتے ہیں۔ اس عورت کی آنکھوں کی حرکت بھی بے معنی نہیں لگتی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ یہ پہنچانے والی عورت ہے۔ اُس نے آتے ہی مظلوم سے لہجے میں پوچھا کہ میں نے اُس کی بیٹی کو کس جُرم میں بٹھایا ہُوا ہے۔

"اصل جرم تمہارا ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "تمہاری بیٹی نے جو جُرم کیا ہے وہ بھی تمہارا ہے" ــــ وہ کچھ کہنے لگی تو میں بول پڑا ــــ "زبان بند رکھ چڑیل! تُو نے اپنی بیٹی کو دوسروں کا کھلونا بنایا ہُوا ہے..... مجھے صرف یہ بتا دے کہ شاداں کی زری جُوتی کہاں ہے۔ اگر گھر میں ہے تو جا کے لے آ۔"

"وہ تو معلوم نہیں کس کے گھر میں ہے" ــــ اُس نے کہا ــــ "گاؤں میں ہی ایک شادی تھی۔ رات کو گئی اور بیٹی کی زری جُوتی پہن کر گئی۔ شادی پر اُن لوگوں کے بے شمار رشتہ دار آتے ہوتے تھے۔ گاؤں کی بہت سی عورتیں بھی تھیں۔ جُوتی اُتار کر رکھی اور وہاں سے غائب ہو گئی۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"یہی کوئی پندرہ بیس روز ہو گئے ہیں" ــــ اُس نے جواب دیا۔

"شاداں بھی گئی ہوگی؟"

"نہیں" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "میں نے اُس کا باہر نکلنا بند کر رکھا تھا۔"

"تم بکواس کرتی ہو" ــــ میں نے کہا ــــ "شاداں اس لئے نہیں گئی تھی کہ اُس نے نذیر سے کہا تھا کہ آج رات ماں شادی پر جاتے گی اور تم آجانا"

"نہیں" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "میں نے نذیر کے ساتھ اس کا میل جول بند کر دیا تھا۔"

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ یہ رات جو گزر گئی ہے شاداں گھر میں نہیں تھی" ــــ میں نے کہا ــــ "کیا وہ تمہیں بتا کر گئی تھی یا تمہیں سوتا چھوڑ گئی تھی؟"

"تھانیدار جی" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "وہ کہیں نہیں گئی۔ آپ جھوٹے الزام نہ لگائیں۔"

میں نے اس عورت کو بہت ذلیل کیا اور اسے بھیج دیا۔ میں سوچنے لگا کہ ماں بیٹی کا بیان ملتا ہے۔ یہ تو میں دیکھ ہی چکا تھا کہ جُوتی شاداں کے پاؤں میں فٹ نہیں آتی تھی۔ میں ابھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ شاداں کا اس واردات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ موچی نے دو اور عورتوں کے نام لئے تھے جن کے لئے اُس نے زری جوتیاں تیار کی تھیں۔ میں نے موچی کو پھر بلا یا اور ان تین جوڑوں کے متعلق مزید دریافت کیا۔ اُس نے میرے پاس پڑی ہوئی جُوتی کو دیکھ کر کہا کہ اسی ناپ کی ایک اور جُوتی اُس نے ایک ہندو کی بیٹی کے لئے بنائی تھی اور تیسری جُوتی کا ناپ اس سے دو اُنگل بڑا تھا۔

"یہ لڑکی چال چلن کی کیسی ہے؟" ــــ میں نے موچی سے پوچھا ــــ "تم کچھ جانتے ہو؟"

"کسی کے لئے مُنہ سے بُرا لفظ نکالتے ڈر لگتا ہے" ــــ موچی نے بڑی عاجزی سے جواب دیا ــــ "یہ بتا سکتا ہوں کہ اس ہندوانی کی جُوتی کے پیسے نذیر نے دیتے تھے۔"

"تم نے پہلے بھی کبھی اس لڑکی کی جُوتی بنائی تھی؟"

"نہ جی" ــــ موچی نے جواب دیا ــــ "ہندو مرمت کے لئے اپنی جُوتیاں بھیج دیتے تھے، نئی جُوتیاں مجھ سے نہیں بنواتے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ لوگ شہروں سے سلیپر یا چپلیاں منگوا کر پہنتے ہیں۔"

"تمہیں یہ جُوتی بنانے کو کس نے کہا تھا؟"

"کہا تو اسی لڑکی نے ہی تھا" ــــ موچی نے جواب دیا ــــ "میرے گھر آئی تھی۔ میں نے ناپ لے کر جُوتی بنا دی۔ جب جُوتی لینے آئی تو کہنے لگی کہ پیسوں کا فکر نہ کرنا، پہنچ جائیں گے۔ اُسی شام کو نذیر مجھے ملا اور پیسے اُس

نے مجھے دے دیتے۔"

یہ بات بڑی صاف تھی۔ یہ تو ابھی دیکھنا تھا کہ یہ ہندو لڑکی کیا کہتی ہے، اتنا ضرور ہُوا کہ شاداں کے خلاف میرا شک کچھ اور نرم پڑ گیا۔ اس ہندو لڑکی کو شاملِ تفتیش کرنے سے پہلے میں نے سوچا کہ ذرا تصدیق کر لوں کہ نذیر کے ساتھ اس کے تعلقات تھے بھی یا نہیں۔ میں نے نمبردار کو بلایا۔ اُسے ایک بار پھر بُرا بھلا کہا کہ وہ تفتیش میں دخل اندازی نہ کیا کرے۔ اُس سے پوچھا تو اُس نے کہا کہ نذیر کے متعلق کوئی بھی قسم نہیں کھا سکتا کہ اس کے کسی کے ساتھ تعلقات ہیں یا نہیں۔ نمبردار کے ساتھ باتیں کرتے کرتے نذیر کی بیوی کا ذکر آ گیا۔ نمبردار کہنے لگا کہ وہ کچھ بتا سکتی ہے۔ اُس نے ایک دو مرتبہ نمبردار سے شکایت کی تھی کہ نذیر باہر زیادہ دلچسپی رکھتا ہے۔ میں نے اس عورت کے ساتھ بات کرنا ضروری سمجھا اور اُسے بلا لیا۔

"آپ کے لئے مسلمان ہو جاؤں گی"

وہ روتی ہوئی آئی اور کچھ دیر روتی ہی رہی۔ میں نے یہ کہہ کر اُسے تسلی دی کہ نذیر زندہ ہے اور وہ بچ جائے گا حالانکہ مجھے اُس کے بچنے کی امید کم ہی نظر آتی تھی۔

"وہ جیتے یا مرے، مجھے اُس نے جیتے جی مار رکھا ہے" — اُس نے کہا — "اُسے باہر کے چسکے نے مروایا ہے۔"

"یہ تو میں سب کچھ جانتا ہوں" — میں نے کہا — "اگر تمہیں معلوم ہے تو مجھے اُن عورتوں کے نام بتا دو جن سے وہ ملتا ملاتا تھا۔"

"ایک تو شاداں ہے" — اُس نے کہا — "شاداں تو شادی سے پہلے ہی اس کے دماغ پر سوار تھی۔ پھر اُس کی ادھر شادی ہو گئی، مجھے اس کے ساتھ باندھ دیا گیا اور یہ شاداں سے ملنے ملانے لگا۔ عورتیں مجھے بتانے لگیں کہ اپنے گھر کا خیال کرو، یہ شاداں اور اُس کی ماں تمہارا گھر اُجاڑ رہی ہیں۔ پہلے ایک شاداں

ہی تھی پھر مجھے کسی نے بتایا کہ ایک ہندو کی بیٹی کے ساتھ بھی نذیر نے تعلق جوڑ لیا ہے۔ اُس لڑکی کا نام سیتا ہے۔ بڑی شیطان لڑکی ہے۔ ماں باپ جہاں اُس کا رشتہ کراتے ہیں وہ صاف جواب دے دیتی ہے۔ میں نے دو تین مرتبہ نذیر کو اس بدکاری سے روکا تھا جس کے جواب میں اُس نے مجھے گالیاں دی تھیں۔ پھر میں صبر شکر کر کے چُپ ہو گئی۔"

مجھے نذیر کے دو دوستوں کے نام بتائے گئے۔ میں نے دونوں کو بلایا اور دونوں کو اکٹھے بٹھا لیا۔ انہیں کہا کہ ان کا دوست مارا گیا ہے اور وہ ملزموں کو پکڑنے کے لئے کچھ بھی نہیں کر رہے۔ وہ بڑے غصے میں تھے اور کچھ کرنا چاہتے تھے لیکن انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کریں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ نذیر کے تعلقات کون کون سی عورت کے ساتھ تھے۔ اُنہوں نے بھی یہی دو نام لئے — شاداں اور سیتا۔

"کیا نذیر نے کبھی راجہ مراد خان کے متعلق بات کی تھی کہ اُس کی طرف سے یا اُس کے بیٹے جمال خان کی طرف سے اسے خطرہ ہے؟" — میں نے اُن سے پوچھا — "یہ باپ بیٹا اپنی بے عزتی کا انتقام لینا چاہتے ہوں گے۔"

دونوں نے جواب دیا کہ نذیر کی مراد خان اور جمال خان کے ساتھ بول چال بند تھی لیکن نذیر نے کبھی ذکر نہیں کیا کہ ان دونوں سے وہ کوئی خطرہ محسوس کر رہا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ نذیر کی کسی اور کے ساتھ دشمنی نہیں تھی۔

اب میرے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ سیتا کو شاملِ تفتیش کروں۔ مسلمانوں اور ہندوؤں میں کھچاؤ تو رہتا ہی تھا۔ یہ ہندوؤں کے لئے اچھا بہانہ تھا کہ وہ مسلمانوں سے ٹکر لیں۔ انہوں نے سیتا اور نذیر کو اکٹھے پکڑ لیا ہو گا اور نذیر کو وہ قتل کر گئے ہوں گے۔

میں نے سیتا کو بلایا تو اس کا باپ بھی دو سرکردہ ہندوؤں کو ساتھ لے کر آ گیا۔ وہ سیتا کے لئے پریشان تھے۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ سیتا کے خلاف کوئی الزام نہیں اور میرے پاس یہ بالکل محفوظ رہے گی۔ یہ سرکردہ ہندو گاؤں کے رہنے والے نہایت معمولی پڑھے ہوتے آدمی تھے۔ ان کی طرف سے

ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ میرے خلاف اوپر درخواست بھیج دیں گے کہ میں ان کی بیٹی کو بلاوجہ اپنے پاس بلا کر پریشان کر رہا ہوں۔

انہیں باہر نکالا اور سیتا کو اپنے سامنے بٹھایا۔ وہ بھی شاداں کی طرح خوبصورت لڑکی تھی۔

"نذیر نے تمہیں زری جُوتی بنوا کر دی تھی"— میں نے کہا — "وہ کہاں ہے؟"

وہ اتنی زیادہ گھبرائی کہ اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ڈرو نہیں سیتا!"— میں نے کہا — "تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ نذیر کے ساتھ تمہارا تعلق جیسا کیسا بھی تھا، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں .... چلو مجھے جُوتی نہ دکھاؤ۔ یہ بتا دو کہ رات کو تم اُس کے ساتھ تھیں جب تین چار آدمی آ گئے اور اُنہوں نے نذیر پر حملہ کر دیا؟"

"میں اُس کے ساتھ نہیں تھی"— اُس نے کہا۔ زبان اُس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

"پھر اپنی زری جُوتی دکھا دو"— میں نے کہا — "گھر میں ہے تو تمہارے باپ سے کہہ کر منگوا لوں گا"

"وہ جُوتی میں نے اپنی بڑی بہن کو دے دی تھی"— اُس نے کہا۔

"اُس سے منگوا لیتے ہیں"— میں نے کہا۔

"وہ اپنے خاوند کے ساتھ دلّی میں ہے"— اُس نے کہا — "اُس کا خاوند وہاں ملازم ہے"

میں نے زری جُوتی جو میرے پاس پڑی تھی اُس کے آگے کر کے کہا کہ وہ جُوتی پہنے۔ اُس نے پہنی تو یہ اُسے فِٹ آ گئی۔ کھوجی کو بلا کر کہا کہ سیتا کا کھُرا دیکھے۔ اُس نے مٹی لا کر اس پر کھُرا دیکھا تو کہنے لگا یہ کھُرا موقعہ واردات والے کھُرے سے ملتا ہے۔

سیتا پر میرا شک پکا ہو گیا۔ جُوتی کے متعلق اُس نے جھوٹ بولا تھا کہ اپنی بڑی بہن کو دے دی تھی۔ میرے پاس جو جُوتی تھی وہ اسی کی تھی مگر وہ مان نہیں رہی تھی۔ اُس نے نذیر کے ساتھ اپنی دوستی تسلیم کر لی لیکن جُوتی کے متعلق اُسی جواب پر قائم رہی جو وہ پہلے دے چکی تھی۔ میں اُسے کہہ رہا تھا کہ وہ صرف یہ بتا دے کہ اس جگہ جہاں وہ نذیر کے ساتھ تھی وہاں کیا ہُوا تھا مگر وہ مان نہیں رہی تھی۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ وہ اس کوشش میں ہے کہ اُس کے راز پر پردہ پڑا رہے۔ میرا مطلب کچھ اور تھا۔ مجھے اُس کی عزّت کا نہیں اپنی ڈیوٹی اور اپنی نوکری کا خیال تھا۔

میں نے اُسے کہا کہ میں اُس کے باپ، بھائیوں اور ماں سے کہتا ہوں کہ وہ اُس سے اصل بات اگلوائیں۔ اُس نے ہاتھ جوڑ دیئے پھر میری ضد دیکھ کر اُس نے میرے پاؤں پکڑ لئے۔ میں نے پھر اپنا سوال دُہرایا تو اس نے اپنے مذہب کی اور اپنے بھائیوں کی قسمیں کھا کر کہا کہ وہ نذیر کے ساتھ نہیں تھی۔ اُس نے یہ بھی بتا دیا کہ نذیر کے ساتھ اس کی کہاں کہاں ملاقات ہو چکی ہے اور ہر ملاقات میں کیا ہُوا تھا لیکن اس آخری ملاقات کو وہ نہیں مان رہی تھی۔

"جب تک مانو گی نہیں میں چھوڑوں گا نہیں"— میں نے کہا — "تمہیں تھانے لے جاؤں گا وہاں حوالات میں بیٹھی رہنا"

اُس کے لئے یہ دھمکی معمولی نہیں تھی۔ اُس کی جو حالت ہو رہی تھی وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ آخر اُس نے وہی حرکت کی جو شاداں میرے ساتھ کر چکی اور سروس میں ایسی کتنی جوان لڑکیوں نے میرے ساتھ یہ حرکت کی تھی۔ اُس ہندو لڑکی نے اپنا آپ مجھے پیش کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس لڑکی کا جسم بڑا ہی دلکش اور قیمتی تحفہ تھا، پھر جس اشتعال انگیز انداز سے اُس نے اپنا تحفہ مجھے پیش کیا اُسے ٹھکرانے کے لئے فولاد جیسے مضبوط دل کی ضرورت تھی۔

میں اُس وقت جوان تھا۔ آج بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس ذاتِ باری نے مجھے اتنی طاقت عطا کی تھی کہ میں شیطان کا اتنا کاری اور زبردست وار بچا گیا۔ یہ تو زیر اور زبر کا فرق ہوتا ہے۔ ذرا جتنی لکیر نیچے ڈال دو

یا اوپر۔ جس طرح زندگی اور موت ساتھ ساتھ چلتی ہیں اسی طرح گناہ بھی انسان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ بال برابر فرق ہوتا ہے۔ یہی فرق جنت اور جہنم میں ہے۔ پاؤں ذرا سا پھسلتا ہے تو انسان ادھر سے اُدھر جا پڑتا ہے۔

عورت انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ یہ مجھ سے پوچھیں کہ یہ فلسفہ کیا ہے۔ آدمی خود کمزور نہ ہو تو کوئی طاقت اُسے کمزور نہیں کر سکتی۔ یہ میں مانتا ہوں کہ ہر انسان ایک حسین اشتعال کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس اشتعال کو بادشاہوں نے بھی قبول کیا ہے۔ انہوں نے عورت کو اپنی کمزوری بنایا اور نہ صرف اُن کے اپنے تختے اُلٹے بلکہ تاریخ کا پانسہ پلٹ گیا۔

اس کی گواہی پورے وثوق سے میں دیتا ہوں کہ عورت نے قاتلوں کو پھانسی کے تختے سے اُتارا ہے اور عورت نے قتل کروا کے اچھے بھلے آدمیوں کو قاتل بنایا اور پھانسی کے تختے تک یا کالا پانی تک پہنچایا ہے لیکن قصور کس کا ہے؟ عورت کا یا آدمی کا؟ کہتے ہیں شراب حرام ہے اور بہت بُری چیز ہے لیکن یہ قصور شراب کا ہے یا شرابی کا؟ زہر تو زہر ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اسے مُنہ میں ڈالو تو آدمی مر جاتا ہے تو پھر اسے مُنہ میں کیوں ڈالیں؟ قصوروار تو وہ ہے جس نے زہر کو زہر سمجھ کر اپنے ہاتھوں اپنے مُنہ میں ڈالا۔

میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ میں تھانیدار سے فلاسفر بن گیا ہوں۔ بہت بوڑھا ہو گیا ہوں۔ بات شروع کرتا ہوں تو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ یہ بات شروع کہاں سے کی تھی اور ختم کہاں کروں۔ ڈائری نہ ہوتی تو کوئی بھی واردات یاد نہ رہتی۔ میں اس ہندو لڑکی کی بات سُنا رہا تھا۔ اس نے اپنا آپ پیش کیا تو ایسے لگا جیسے بجلی کا کرنٹ سَر کی طرف سے داخل ہو کر پاؤں کی طرف سے نکل گیا ہو۔ میں نے گہرا سانس لیا۔ اپنے آپ کو قابو میں لیا اور اُس کی طرف دیکھا۔

"آپ کے پیچھے میں مسلمان ہو جاؤں گی" — اُس نے کہا۔

لڑکیوں جیسا تھا

میں نے ایک اور راستہ اختیار کیا۔ اس سوچ کے مطابق میں نے اُس سے پوچھنا شروع کیا۔

"کیا تمہارے باپ کو، بھائیوں کو یا کسی اور کو معلوم ہے کہ نذیر کے ساتھ تمہاری دوستی ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"گھر میں مجھے کبھی کسی نے اس معاملے میں کچھ نہیں کہا" — اُس نے جواب دیا — "اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں معلوم نہیں۔"

"ہندوؤں یا سکھوں میں سے کسی عورت یا آدمی نے تمہیں کبھی کچھ کہا تھا؟" — میں نے پوچھا اور اُسے کہا — "تمہارے دل میں نذیر کی محبت ہے، اسی لئے تم نے اپنی آبرو بھی اُسے دے دی ہے۔ کیا تم نہیں چاہتیں کہ نذیر کو جس نے مارا ہے اُسے سزا ملے؟"

"چاہتی تو میں بھی ہوں" — اُس نے کہا — "لیکن بدنامی سے ڈرتی ہوں۔ ہر کسی کو پتہ چل جائے گا۔"

"کسی کو پتہ نہیں چلے گا" — میں نے کہا — "تم بات کرو.... پہلے یہ بتاؤ کہ نذیر سے پہلے تمہاری دوستی کس کے ساتھ تھی؟"

دو چار اور چکنی چپڑی اور پیار محبت کی باتیں کیں تو اُس نے کچھ باتیں بتائیں۔ نذیر سے پہلے اُس کی دوستی ایک نوجوان ہندو کے ساتھ تھی۔

"تم نے اس کی دوستی چھوڑ دی تو اُس نے تمہیں کچھ کہا ہو گا!"

"اُس میں اتنی جان ہی نہیں تھی" — اُس نے کہا — "بڑا خوبصورت لڑکا ہے لیکن لڑکیوں جیسا ہے ..... دو آدمی اور ہیں جو میرے ساتھ دوستی لگانا چاہتے تھے۔"

اُس نے ایک سکھ کا اور ایک ہندو کا نام لیا اور کہنے لگی کہ دونوں پکے بدمعاش ہیں۔ میں نے سوال جواب کئے تو اُس نے بتایا کہ دونوں نے اُسے کہا تھا کہ مسلمان (نذیر) کی دوستی سے باز آجاتے۔ بیتا نے دونوں کو صاف

جواب دیا تو اُنہوں نے اُسے ایک ہی جیسی دھمکی دی کہ وہ اُسے بھی اور نذیر کو بھی غائب کر دیں گے۔

میں نے پھر اسے کہا کہ وہ مان جائے کہ گذشتہ رات وہ نذیر کے ساتھ تھی۔ وہ نہ مانی۔ اب اُس نے یہ بات بتائی کہ اُس نے ایسا خطرہ کبھی مول نہیں لیا تھا کہ گھر والوں کو سوتا چھوڑ کر نذیر کے بلانے پر چلی جاتی۔ شام کے کھانے کے بعد وہ تین چار لڑکیوں کے ساتھ کھیتوں کی طرف سیر سپاٹے کے لیے جایا کرتی تھی اور اگر نذیر آجاتا تو لڑکیوں میں سے کھسک کر ذرا اُدھر چلی جاتی تھی۔ اُس نے پہلے بھی مجھے ایسی کچھ ملاقاتیں سنائی تھیں۔ اب اُس نے یہ بتایا کہ وہ اُس وقت باہر نکلنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی جب گھر والے سوتے ہوتے تھے۔

یہ ایک مسئلہ تھا کہ میں سیتا کی اس بات کو سچ مانوں یا جھوٹ، میں اب ان بدمعاشوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ سیتا کو میں نے باہر بیٹھنے کو کہا اور نمبردار کو بلا کر ان دونوں بدمعاشوں کے متعلق پوچھا۔ نمبردار نے راتے تو ذرا ڈھیلی سی دی لیکن اس نے ان کی بدمعاشی کی تصدیق کر دی۔ ذیلدار اور سفید پوش وغیرہ بھی تھے۔ ان سے باری باری پوچھا۔ انہوں نے مجھے ان دونوں کی بدمعاشی کے زیادہ قصے سنائے۔ میں نے محسوس کیا کہ نمبردار نے مجھے بہت کم بتایا تھا۔

"نمبردار کی ان دونوں کے ساتھ دوستی تو نہیں؟" — میں نے ذیلدار، سفید پوش اور معزز قسم کے مخبروں سے پوچھا۔

جواب ملا کہ نمبردار کے ساتھ ان کی گہری دوستی ہے۔ ان لوگوں نے نمبردار کے متعلق کچھ اور باتیں بھی بتائیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ نمبردار شاداں کے گھر بھی جاتا ہے۔ میں نے نمبردار کے خلاف یہ اور کچھ اور باتیں ذہن میں رکھیں۔ یہ غلط بھی ہو سکتی تھیں کیونکہ یہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف بولتے رہتے تھے۔ ظاہری طور پر ایک دوسرے کے دوست ہوتے تھے۔ اگر میں کہہ دیتا کہ نمبردار شریف آدمی ہے تو یہ لوگ مجھے اُس کی شرافت کی کہانیاں سُنا دیتے۔ اتنا تو میں جانتا تھا کہ نمبردار شریف لوگ نہیں ہُوا کرتے تھے۔

شام ہو گئی تھی۔ قصبے کے ہسپتال سے ایک کانسٹیبل یہ خبر لے کر آیا کہ

نذیر نہ صرف بچ گیا ہے بلکہ ہوش میں آگیا ہے لیکن بولتا نہیں۔ میں نے اسے دہشت کا اور سر کی چوٹوں کا اثر سمجھا۔ ڈاکٹر نے تازہ خون مانگا تھا۔ نذیر کے کتنے رشتہ دار اور برادری کے آدمی ہسپتال میں موجود تھے۔ انہوں نے خون دینا شروع کر دیا تھا۔ نذیر کے جسم سے بہت زیادہ خون نکل گیا تھا۔ وہ جوان اور تندرست آدمی تھا اس لئے زندہ رہا۔

اس خبر سے مجھے اطمینان ہُوا۔ مجھے امید تھی کہ تازہ خون رگوں میں جانے سے وہ کچھ وقت بعد یا زیادہ سے زیادہ صبح ہونے تک بولنے کے قابل ہو جائے گا۔ میں نے وہاں سے ڈیرہ سمیٹا اور اپنے تھانے کو روانہ ہو گیا۔ وہ ایک پوری فوج تھی جسے میں اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ یہ سب مشتبہ تھے اور وہ لوگ جن سے کچھ پوچھنے کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ ان میں شاداں، اُس کی ماں اور سیتا بھی تھیں۔ ان میں وہ دو بدمعاش بھی تھے جن میں ایک ہندو تھا اور ایک سکھ۔

میں ان سب کے آگے روانہ ہُوا۔ میں گھوڑی پر تھا، سیدھا ہسپتال گیا اور ڈاکٹر سے ملا۔ وہ بہت محنت کر رہا تھا۔ وہ ہندو تھا۔ ودھیا ناتھ شرما اُس کا نام تھا۔ اس نے ضربوں اور زخموں کی تفصیلات سنائیں جو تقریباً وہی تھیں جو میں پہلے سنا چکا ہوں۔

"مجھے ایک خطرہ نظر آ رہا ہے" — ڈاکٹر شرما نے کہا — "یہ بول نہیں رہا۔ میں اس کے ساتھ بات کرتا ہوں تو میرے مُنہ کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ اس کی ماں کو، باپ کو، بیوی کو، اُس کے دونوں بچوں کو باری باری اس کے قریب کھڑا کیا لیکن ایسے لگا جیسے اس نے کسی کو بھی نہیں پہچانا۔ میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اسے ہوش میں آتے ابھی ڈیڑھ پونے دو گھنٹے ہی ہوتے ہیں۔ کل تک صحیح صورت سامنے آجائے گی۔"

"ایسا تو نہیں کہ اس کی یادداشت ختم ہو گئی ہو؟"

"میں یادداشت کی ہی بات کر رہا ہوں" — ڈاکٹر شرما نے جواب دیا — "سر کی ضربیں شدید ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دماغ مجروح ہو گیا ہے۔"

"اس کا علاج؟"

"اگر ایسی صورت ہوتی تو سول سرجن کے پاس بھیج دوں گا" — ڈاکٹر نے کہا — "ڈسٹرکٹ سول ہسپتال میں شاید کچھ علاج ہو جاتے لیکن اس کا کوئی علاج نہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ شاید بہتری ہو جاتے، لیکن ضروری نہیں کہ ایسا ہو گا۔ اسے خون کافی مل چکا ہے۔ کل تک دیکھ لیں۔ جونہی یہ بولنے کے قابل ہوا میں آپ کو بلا لوں گا۔"

میں تھانے چلا گیا اور دل میں یہ دعا کرتا گیا کہ مضروب بولنے اور سمجھنے کے قابل ہو جاتے۔

نمبردار، نذیر اور شاداں

تھانے جاتے ہی سکھ اور ہندو بدمعاش کو باری باری بلایا اور اُن سے ایک ہی جیسے سوال کئے۔ انہوں نے بتایا کہ سیتا کو انہوں نے پھانسنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ان کے ہاتھ نہ آئی۔ دونوں نے بتایا کہ انہیں معلوم تھا کہ اس نے نذیر کے ساتھ دوستی لگا رکھی ہے۔ دونوں نے فوراً تسلیم کر لیا کہ انہوں نے سیتا کو دھمکی دی تھی کہ وہ اُسے اور نذیر کو غائب کر دیں گے لیکن ان میں اتنی جرأت نہیں تھی۔ یہ تو گیدڑ بھبکی تھی۔

ان دونوں کی بدمعاشی یہ تھی کہ شراب پیتے تھے، جوا کھیلتے تھے اور جوئے کا اڈہ چلاتے تھے اور بڑھکیں مارتے تھے۔ ان کے خلاف چوری یا لڑائی مار کٹائی کی کبھی رپورٹ نہیں ملی تھی۔ میں نے انہیں بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھ لیا۔ مجھے یہ اس واردات میں صاف نظر آتے لیکن میں نے ان پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ انہیں الزام سے بَری سمجھتا ہوں۔ اس قسم کے بدمعاش پولیس سے بہت ڈرتے تھے۔ انہیں اصل ڈر یہ ہوتا تھا کہ تھانیدار دس نمبر میں رجسٹر نہ کر لے۔

میں نے پہلے ہی ان دونوں کے دلوں میں یہ ڈر پیدا کر دیا تھا کہ ان دونوں کو دس نمبر میں رجسٹر ہونا چاہیئے۔ وہ میرے آگے بچھنے لگے۔ میں نے دونوں کو اکٹھا بٹھا لیا اور انہیں کہا کہ وہ میری مدد کریں اور کچھ بتائیں۔ اس

قسم کے بدمعاش اور چھوٹے موٹے جرائم کرنے والے بڑے اچھے مخبر ہوتے تھے۔

"آپ صرف اس بات پر ہم پر یہ شک نہ کریں کہ ہم نے نذیر کو مارا ہے کہ ہم سیتا کو پھانسنے کی کوشش کرتے تھے" — سکھ نے کہا — "اس طرح تو نمبردار بھی شاداں کو پھانسنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے لیکن شاداں اس کے ہاتھ نہیں آ رہی۔ آپ اُس پر شک کیوں نہیں کرتے؟"

"شاداں اب کسی کے ہاتھ نہیں آتے گی" — میں نے ایسے لہجے میں کہا جیسے میں نے اُن کی اس بات کو اچھی طرح سُنا ہی نہ ہو — "شاداں نے تو نذیر کے ساتھ بھی تعلق توڑ لیا ہے۔"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پہلے وہ مسکراتے پھر ہنس پڑے۔

"واہ بھولے بادشاہ!" — سکھ نے کہا — "یہ تعلق ٹوٹنے والے نہیں ہوتے۔ شاداں اور نذیر کا تعلق ابھی تک چل رہا ہے۔"

"تعلق ٹوٹنے والی بات آپ کو کس نے بتائی ہے؟" — ہندو نے پوچھا۔

"شاداں کہتی تھی" — میں نے جواب دیا — "اس کی ماں بھی کہتی تھی کہ اُس نے شاداں کو قید کر کے رکھا ہوا ہے۔"

دونوں نے ماں بیٹی کو ایک ایک گالی دی اور کہنے لگے کہ وہ جھوٹ بولتی ہیں۔ ان دونوں بدمعاشوں کے ساتھ میری جو باتیں ہوئیں اور جس لہجے اور انداز میں ہوئیں، وہ اگر آپ کو تفصیل سے سناؤں تو آپ مجھے بھی بدمعاش کہنا شروع کر دیں گے۔ یہ پولیس اور مجرموں کی دنیا کی باتیں ہیں۔ یہ ہیں تو دلچسپ لیکن بہت لمبی ہیں اور گندی بھی ہیں۔ آپ کو سنانے والی بات یہ ہے کہ انہوں نے مجھے دو باتیں ایسی بتائیں جن سے میری تفتیش آسان ہو گئی۔

نذیر کے ساتھ ان دونوں بدمعاشوں کے دوستانہ تعلقات تھے۔ وہ انہیں شاداں اور سیتا کی دوستی کی باتیں سناتا رہتا تھا۔ نذیر کبھی کبھی شراب پیا کرتا تھا۔

یہ دیسی شراب اُسے یہ دونوں پلایا کرتے تھے اور پیسے نذیر دیا کرتا تھا۔ شاداں نے طلاق لینے کے بعد بھی نذیر کے ساتھ پہلے کی طرح میل ملاپ رکھا ہُوا تھا۔ اُس نے اِن دونوں بدمعاشوں کو بتایا تھا کہ اب شاداں کی ماں اُسے نذیر سے ملنے سے روکتی ہے، پھر بھی شاداں باز نہیں آتی اور وہ بڑی دلیری سے نذیر سے ملتی ہے۔

باتوں باتوں میں نمبردار کے متعلق باتیں ہونے لگیں تو میں نے انہیں کہا کہ انہوں نے کہا تھا کہ اب نمبردار شاداں کو پھانسنے کی کوشش کر رہا ہے، دونوں نے نمبردار کی باتیں سنانی شروع کر دیں۔

"وہ تو سنا ہے تمہارا گہرا دوست ہے!" ۔۔۔ میں نے کہا۔

"او بھولے بادشاہ!" ۔۔۔ سکھ نے کہا ۔۔۔ "دوستی کیسی! اُس کی مُٹھی چاپی کرتے رہتے ہیں کہ کبھی مشکل وقت آ پڑے تو ہماری مدد کرے اور ہمیں دس نمبر پر نہ چڑھنے دے۔ ہم اُسے شراب پلاتے رہتے ہیں۔ پیسہ ایک نہیں لیتے اُس سے۔"

"کیا وہ شاداں کے گھر جاتا ہے؟" ۔۔۔ میں نے پوچھا۔

"شاداں کی ماں کا تو وہ مرید بنا ہُوا ہے" ۔۔۔ ہندو نے کہا ۔۔۔ "آج کا واقعہ آپ کو سناتا ہوں۔ آپ جب اُس کی ڈیوڑھی میں لوگوں سے بیان لے رہے تھے اُس وقت میں بھی وہاں باہر لوگوں میں موجود تھا۔ اُس وقت آپ نے شاداں کو اندر بٹھایا ہُوا تھا اور نمبردار بھی آپ کے ساتھ اندر ہی تھا۔ وہ اندر سے نکلا تو سیدھا شاداں کے گھر چلا گیا اور کچھ دیر بعد واپس آیا۔ پھر آپ نے شاداں کی ماں کو بلایا تھا۔"

مجھے دھچکہ سا لگا۔ دماغ سے ایک خیال اُٹھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ سکھ اور ہندو کچھ نہ کچھ بولتے رہے اور میں ویسے ہی ہوں ہاں کرتا رہا۔ یہ میری عقل کا امتحان تھا۔ میرا دماغ کوئی معمہ حل کر رہا تھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں نے شاداں سے پوچھا تھا کہ اُس کی زری جُوتی کہاں ہے تو وہ جھجک جھجک کر اور رُک رُک کر بولی تو نمبردار نے اُسے کہا تھا کہ یہ وہی جُوتی تو نہیں جو تمہاری ماں ڈھونڈتی پھرتی تھی، کہتی تھی کہ شادی والے گھر سے کسی نے غائب کر دی ہے۔ میں نے نمبردار

کو ڈانٹ کر باہر نکال دیا تھا۔ اس کے بعد میں نے شاداں سے جُوتی کے متعلق پوچھا تو اُس نے یہی جواب دیا تھا کہ شادی والے گھر سے چوری ہو گئی تھی۔

مجھے خیال آیا کہ نمبردار کو میں نے باہر نکال دیا تھا تو وہ شاداں کے گھر چلا گیا اور اُس کی ماں سے کہا ہو گا کہ جوتی کے متعلق یہ بیان دے۔ ماں آئی تو اُس نے وہی بیان دیا جو شاداں دے چکی تھی۔ یہ تو میں نے دیکھ لیا تھا کہ نمبردار صاف دل آدمی نہیں۔

میں نے ان دونوں بدمعاشوں کو کچھ دیر اور بٹھایا۔ انہیں یہ تسلی دی کہ وہ اب مشتبہ نہیں۔ انہیں باہر بیٹھنے کو کہا اور شاداں کو بلایا۔ اُسے میں نے صبح سے بٹھا رکھا تھا۔ اُس کی حالت بہت بُری ہو چکی تھی۔

چاندنی رات اور خالی کھیت

"آپ مجھے کب چھوڑیں گے؟" ۔۔۔ اُس نے روتی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔

"جب سچ بولو گی" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "ابھی تو میں نے تمہیں باہر بٹھایا ہُوا ہے۔ اب جھوٹ بولو اور چلو حوالات میں ... کہہ دو یہ زری جُوتی تمہاری ہے۔ فوراً بولو اور مجھے ساری بات بتا دو۔ میں تمہیں حوالات میں ڈال کر دو آدمیوں کو تمہارے ساتھ بند کر دوں گا۔ صبح تمہاری ماں تمہیں پہچان نہیں سکے گی ... بولو!"

میں نے اُسے بیٹھنے نہ دیا۔ خود بھی اُٹھ کر اُس کے سامنے جا کھڑا ہُوا اور سوال دہرایا۔

"اگر میں کہہ دوں کہ یہ جُوتی میری ہے تو کیا ہو جائے گا؟" ۔۔۔ اُس نے پوچھا۔

میں نے بڑی زور سے اُس کے مُنہ پر تھپڑ مارا۔ وہ دیوار کے ساتھ جا لگی۔

"مجھ سے نہ پوچھو" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "میں جو پوچھتا ہوں اُس

کا جواب دو۔"

وہ گال پر ہاتھ رکھ کر دیوار کے ساتھ بیٹھ گئی۔ میں نے اُس کا کان پکڑ کر اٹھایا اور دانت پیس کر کہا کہ جواب دو۔

"ہاں!" — اُس نے روتے ہوئے کہا — "یہ جُوتی میری ہے۔"

"اِس کا مطلب یہ ہے کہ نذیر کے ساتھ تم تھیں" — میں نے کہا۔

وہ زبان سے نہ بولی۔ سَر ہلا کر ہاں کا اشارہ کیا۔ میں نے اُسے بٹھایا اور کہا کہ وہ پورا بیان دے۔

"پھر آپ مجھے حوالات میں بند تو نہیں کریں گے؟" — اُس نے پوچھا۔

"نذیر کو تم نے مروایا ہے؟"

"نہیں جی!" — اُس نے جواب دیا — "وہ تو مجھے بھی مار جاتے لیکن بھاگ آئی۔"

"پھر میں تمہیں حوالات میں کیوں بند کروں گا" — میں نے کہا — "سچ بولو گی تو تمہارا کوئی جرم ہُوا بھی تو دبا لوں گا۔"

اُس نے بتایا کہ نذیر کے ساتھ اُس نے تعلق توڑا نہیں تھا۔ ہاں اُسے روکتی تھی۔ گزشتہ رات وہ ماں کو سوتا چھوڑ کر نکل گئی تھی۔ دن کو نذیر نے اُسے وہاں آنے کو کہا تھا۔ وہ ذری جُوتی پہن کر گئی تھی۔ میرے پوچھنے پر اُس نے جُوتی کھُلی ہونے کی وجہ یہ بتائی تھی کہ یہ جُوتی زیادہ اُس کی ماں پہنتی تھی۔ جُوتی تھوڑی سی کھُلی تھی۔ شاداں نے مجھے صاف بتا دیا کہ میں نے جب اُسے جُوتی پہننے کو کہا تھا تو اُس نے جُوتی میں پاؤں بہت آگے کر دیا تھا۔ اس طرح جُوتی اُس سے ذرا کھُلی نظر آتی تھی جتنی اصل میں کھُلی تھی۔

نذیر راستے میں کھڑا تھا۔ چاندنی رات تھی لیکن بادل چلتے ہوتے تھے اس لئے چاندنی مدھم ہو گئی تھی۔ نذیر کو دیکھ کر وہ سب خطرے بھول گئی اور اُس کے ساتھ وہاں تک پہنچ گئی جو موقعہ واردات بن گیا تھا۔ دونوں گھری جگہ

اُتر گئے۔ یہ ایک خالی کھیت تھا۔

ایک جگہ دونوں رُک گئے اور انہیں تین آدمی آتے دکھائی دیئے۔ نذیر کے پاس لاٹھی تھی۔ اُس نے شاداں سے کہا کہ یہ آدمی گزر گئے تو ٹھیک ہے اور اگر اُنہوں نے گڑبڑ کی تو شاداں اُس کے پیچھے ہو جائے۔ وہ آدمی سیدھے اُن کی طرف آرہے تھے۔ ان کے چہرے نہیں پہچانے جاتے تھے۔ اُنہوں نے چہروں پر پگڑیاں لپیٹ رکھی تھیں۔ شاداں نذیر کے پیچھے ہو گئی — "اُٹھا لو لڑکی کو" — ان آدمیوں میں سے ایک نے کہا — "اور لے چلو۔"

"آگے آؤ بھائیو!" — نذیر نے لاٹھی تان کر کہا — "ہمت کرو اور لڑکی کو اُٹھا لو۔"

"او بدبختا!" — اُدھر سے ایک آواز آئی — "اپنی جان ہمیں نہ دے۔ ہمیں لڑکی چاہیئے۔ تُو چل اپنے گھر!"

میرے پوچھنے پر شاداں نے بتایا کہ وہ ان آوازوں کو نہیں پہچانتی تھی کہ یہ کس کی ہیں۔ ان تینوں نے گھیرا ڈالنے کی کوشش کی۔ نذیر نے ان میں سے ایک پر لاٹھی چلائی۔ شاداں اُس کے پیچھے رہی۔ نذیر نے بڑی تیزی سے لاٹھیاں چلائیں۔

"یہ ہمارے ہی ہاتھوں مرنا چاہتا ہے تو پہلے اسے ختم کرو" — کسی نے کہا — "لڑکی کو تو ہم اُٹھا ہی لیں گے۔"

وہ تینوں نذیر پر ٹوٹ پڑے اور شاداں کو بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا۔ وہ اپنے گاؤں کی طرف جانے کی بجائے دوسری طرف بھاگی۔ آگے کھیت دو تین فٹ نیچے تھا۔ اس کھیت میں اُترتے شاداں کی جُوتی کا ایک پاؤں اُترنے لگا۔ جُوتی چلنے میں تو ٹھیک تھی لیکن دوڑتے ہوتے ذرا کھُلی ہونے کی وجہ سے اُترنے لگی۔ شاداں رُک نہیں سکتی تھی۔ ایک پاؤں سے جُوتی اُتر گئی تو اُس نے پرواہ نہ کی۔ دوڑتی گئی اور ذرا آگے جا کر دوسرے پاؤں سے بھی جُوتی اُتر گئی۔

وہ دُور کا چکر کاٹ کر اپنے گاؤں میں آئی۔ وہاں کی زمین ایسی تھی جو

کھُروں کو محفوظ نہیں رکھ سکتی تھی، اس لئے کھوجی اُس کا پیچھا نہ کر سکا۔ گھر آئی تو اُس کی ماں جاگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ شاداں اس حالت میں گھر میں داخل ہوئی کہ اُس کی سانسیں آپس میں نہیں مل رہی تھیں۔ خوف سے اُس کی جان نکلی جا رہی تھی۔ ماں نے اُسے گالی گلوچ کی۔

شاداں نے ماں کو بتا دیا کہ وہ نذیر کے ساتھ تھی اور نذیر مارا گیا ہے۔ ماں نے سر پیٹ لیا اور اُس سے پوچھا کہ وہ کون تھے۔ شاداں نے کہا کہ وہ کسی کو بھی نہیں پہچان سکی۔ ماں بہت پریشان ہوئی اور جب ماں نے اُسے ننگے پاؤں دیکھا تو پوچھا کہ وہ ننگے پاؤں کیوں تھی؟ شاداں نے اُسے بتایا کہ جُوتی ایک کھیت میں رہ گئی ہے۔

"ہائے اللہ!" — ماں نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا — "تو پکڑی گئی۔ جُوتی پہچانی گئی تو تُو بھی گئی۔"

"وہ چلے گئے ہوں گے" — شاداں نے کہا — "چل کے جُوتی اُٹھا لاتے ہیں۔"

ماں ایسی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بہت چالاک عورت تھی اور شاداں اگر اُس سے زیادہ چالاک نہیں تھی تو کم بھی نہیں تھی۔ ماں کے مجرم دماغ نے ایک بات سوچ لی۔ اُس نے شاداں سے کہا کہ پولیس نے اگر معلوم کر لیا کہ جُوتی شاداں کی ہے اور اگر شاداں سے پولیس نے پوچھا کہ یہ جُوتی اُس کی ہے تو وہ پاؤں جُوتی میں ڈال کر آگے کر لے اور کہے کہ یہ جُوتی کھلی ہے، اُس کی نہیں۔ ماں نے اس سے فائدہ اُٹھایا تھا کہ شاداں کو یہ جُوتی ذرا کھلی تھی۔ شاداں نے مجھے یہی دھوکہ دیا تھا۔

واردات کے متعلق شاداں یہی کچھ جانتی تھی لیکن اس سے صرف شاداں کا مسئلہ حل ہوتا تھا۔ میرا مسئلہ جُوں کا توں موجود تھا۔ یہ تو پتہ ہی نہ چلا تھا کہ وہ کون تھے۔ شاداں نے ان آدمیوں کی جو باتیں سُنی تھیں ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ شاداں کو اُٹھانے آئے تھے اور وہ نذیر پر حملہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

جال میں پھنسی ہوئی تھی

میں نے شاداں سے بہت ساری باتیں پوچھیں۔ میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ شاداں کے ساتھ اور کسے اتنی دلچسپی تھی کہ وہ اسے اُٹھا لے جانے آئے تھے اور نذیر سے کہہ رہے تھے کہ تم گھر چلے جاؤ۔ شاداں جواب دیتی رہی لیکن کوئی سراغ نہیں ملتا تھا۔ پھر میں نمبردار پر آیا اور اُس سے پوچھا کہ یہ شخص بھی اُسے پھانسنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیا نمبردار نے تمہیں کبھی ایسی ویسی بات کہی تھی؟"

"میں اُس کے اشارے سمجھتی تھی" — شاداں نے جواب دیا اور کچھ اشارے اور باتیں مجھے بتائیں، پھر کہنے لگی — "میری ماں کی بہت مُٹھی چاپی اور خوشامد کرتا تھا۔"

"تمہارا رویہ کیا ہوتا تھا؟" — میں نے پوچھا — "کبھی تم نے اُسے نفرت سے دھتکارا تھا؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "میں اُس کے ساتھ ہنس کر بات کرتی تھی اور اُسے ماما کہتی تھی۔ پانچ بچوں کا تو وہ باپ ہے۔ اُس کا بڑا لڑکا سولہ سترہ سال کا ہے ..... اُس نے مجھے دو تین بار کہا تھا کہ شاداں مجھے ماما نہ کہا کرو۔"

میں یہ سراغ لینے کی کوشش کر رہا تھا کہ شاداں نے کبھی نمبردار کو دھتکار دیا ہو گا اور نمبردار نے اسے اُٹھوانے کے لئے آدمی بھیجے ہوں گے۔ یہاں یہ سوال بھی میرے سامنے آتا تھا کہ ان تین آدمیوں کو پتہ کیسے چل گیا کہ آج رات نذیر اور شاداں اُس جگہ ہوں گے۔

"ایک بات بتاؤ" — میں نے شاداں سے پوچھا — "تمہیں نذیر کا یہ پیغام کس نے دیا تھا؟ کیا تم دونوں کے درمیان کوئی عورت تھی؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "نذیر نے گلی میں میرے

پاس سے گزرتے کہہ دیا تھا کہ آج رات وہاں آجانا۔ ہمارا وقت ایک ہی ہوتا تھا۔"

"اگر میں کہوں کہ تمہیں نمبردار اٹھوانا چاہتا تھا تو تم کیا کہو گی؟"

"میرا خیال ہے یہ آدمی اُس کے نہیں تھے" — اُس نے جواب دیا — "میں نے اُس کے ساتھ کبھی ایسی بات نہیں کی تھی جس سے اُسے غصّہ آتا۔ وہ تو ابھی تک امید لگائے ہوئے تھا کہ میں اُس کے ہاتھ آجاؤں گی۔ آپ کو یاد نہیں کہ آپ نے مجھے کہا تھا کہ یہ جُوتی تمہاری نہیں تو مجھے اپنی جُوتی دکھادو۔ میرے پاؤں کے نیچے سے تو زمین نکل گئی تھی۔ میں کہنے بھی لگی تھی کہ وہ جُوتی گُم ہو گئی ہے لیکن میں اس سوچ میں پڑ گئی کہ کیا بتاؤں کہاں گم ہو گئی۔ نمبردار آپ کے پاس بیٹھا ہُوا تھا۔ اُس نے میرا کام آسان کر دیا تھا۔ اُس کا دماغ بڑا تیز ہے۔ اُس نے کہا کہ تمہاری جُوتی تمہاری ماں نے فلاں کی شادی پر گُم کر دی تھی۔"

"کوئی اور ہے جو تمہارے پیچھے پڑا ہُوا ہو اور تم نے اُسے نفرت سے دھتکار دیا ہو؟"

"ایسا تو کوئی نہیں" — اُس نے جواب دیا — "میں نے شاید پہلے کبھی، شاید ٹیلوں کی واردات میں آپ کو ایک بات کہی تھی، وہ میں پھر کہتی ہوں۔ لوگ مجھے بڑی چالاک، ہوشیار اور عقل مند لڑکی سمجھتے ہیں۔ وہ ٹھیک سمجھتے ہیں لیکن میرا چال چلن خراب نہیں تھا۔ میری ماں ٹھیک عورت نہیں۔ میرا باپ اس عورت کی کرتوت پر کُڑھ کُڑھ کر مر رہا ہے۔ یہ مجھ سے دولت کمانا چاہتی تھی۔ اس نے مجھے اس بوڑھے مرادخان کے ساتھ بیاہ دیا۔ میں نے اُسے پہلے کہہ دیا تھا کہ میں نذیر کو پسند کرتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ نذیر کی کھال اُتارتی رہی ہے....

جب اُس نے مجھے ایک بوڑھے کے حوالے کر دیا تو میں نے اُس کا انتقام اس طرح لیا کہ نذیر کو اپنا خفیہ خاوند بنا لیا۔ یہ میرا پہلا گناہ تھا۔ مجھ سے کوئی سی قسم لے لیں، میں کسی اور کو پلے نہیں باندھتی تھی۔ آپ میرے دل کو اپنے گھے

تو میں نے صاف کہا تھا کہ میں آپ کی بیوی بننا چاہتی ہوں لیکن بے نکاحی نہیں۔ میں نے شاید یہ بھی کہا تھا کہ میں ناجائز تعلقات سے تنگ آگئی ہوں۔"

"یہ تم نے طلاق کے بعد بھی جاری رکھے؟"

"جال میں پھنسی ہوتی تھی" — اُس نے کہا — "اگر نذیر کو خدا نے بچا لیا تو اُس سے پوچھنا کہ میں اُسے کہتی تھی کہ اپنی بیوی کو طلاق دو اور میرے ساتھ شادی کر لو یا پہلی بیوی کو بھی رکھو اور مجھے بھی اپنے گھر بسا لو، میں تمہاری بیوی کی خدمت کروں گی۔"

مجھے آج بھی یاد ہے کہ اُس کے آنسو نکل آتے تھے۔ وہ نذیر کے جال سے نکل نہیں سکتی تھی۔ اُس کی ایک مجبوری تو یہ تھی کہ وہ نذیر کو دل وجان سے چاہتی تھی۔ یہ دلی محبت کا نتیجہ تھا کہ وہ نذیر پر اپنا آپ قربان کر رہی تھی۔ دوسری مجبوری یہ کہ نذیر نے اُسے شادی کا جھانسہ دے رکھا تھا۔

"اس ہندو لڑکی کو جانتی ہو جسے میں نے باہر بٹھایا ہُوا ہے؟" — میں نے اُس سے پوچھا۔

"اچھی طرح جانتی ہوں" — اُس نے جواب دیا — "اس کا نام سیتا ہے۔"

"کیا یہ بھی جانتی ہو کہ نذیر کا اس سے بھی وہی تعلق ہے جو تمہارے ساتھ ہے؟"

"یہ نہیں ہو سکتا" — شاداں نے کہا۔

"او تیرے بیوقوف لڑکی!" — میں نے کہا — "یہ لڑکی اپنی زبان سے مان چکی ہے۔"

شاداں نے آہ بھری اور اُس کی آنکھیں جو ابھی پوری طرح خشک نہیں ہوتی تھیں، ایک بار پھر آنسوؤں سے بھر گئیں۔ بہرحال یہ اُس کا اور نذیر کا معاملہ تھا۔ میری دلچسپی اپنی تفتیش کے ساتھ تھی۔ سیتا کے متعلق میری یہ بات سن کر شاداں کی ذہنی حالت ذرا خراب ہو گئی تھی۔

"نذیر کے متعلق ڈاکٹر نے کچھ بتایا ہے؟" — اُس نے پوچھا۔

"وہ بچ گیا ہے" — میں نے جواب دیا — "ہوش میں آگیا ہے لیکن

ابھی بولتا نہیں" — میں نے ویسے ہی کہہ دیا — "وہ تمہارے ساتھ شادی نہیں کرے گا۔ جانے دو محبت کو۔ سب دھوکہ ہے۔ ماں سے کہو کسی کے ساتھ تمہاری شادی کر دے"۔

"بہت بدنام ہو گئی ہوں تھانیدار جی!" — اُس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا — "بہت بدنام ہو گئی ہوں۔ مجھے اب کون قبول کرے گا۔ دو بار پولیس کے چکر میں آ چکی ہوں" — اُس نے ایک اور انکشاف کر ڈالا۔ کہنے لگی — "میری ماں شیطان عورت ہے۔ وہ اب میرا ایک اور سودا کر رہی ہے اور میں اسے قبول نہیں کر رہی" — وہ چُپ ہو گئی اور کچھ سوچنے لگی، پھر جیسے اُسے اچانک کچھ یاد آ گیا ہو۔ کہنے لگی — "پار والے گاؤں (عابدہ کا سُسرالی گاؤں) کا ایک آدمی ہے۔ امیر زمیندار ہے۔ مجھ سے چودہ پندرہ سال بڑا ہے۔ چار اس کے بچے ہیں۔ بیوی زندہ ہے۔ وہ بیوی کو طلاق دے کر میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے اور میری ماں اُسے پسند کرتی ہے، اُس سے پیسے کھاتی ہے اور مجھے کہتی ہے کہ میں اس کے ساتھ شادی کر لوں، آدمی زمین تمہارے نام کر دے گا۔ ابھی پر میری اور ماں کی آپس میں بہت بک بک ہو چکی ہے اور میں اس آدمی کی بے عزتی بھی کر چکی ہوں"۔

"دل کا پیار بھی دھوکہ ہے"

میں تو اندھیرے میں ہاتھ مار رہا تھا۔ ذرا سا کوئی اشارہ ملتا تھا تو میں اُسی طرف چل پڑتا تھا۔ یہ اشارہ بھی میرے کام آ سکتا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں کریدنا شروع کیا تو پتہ چلا کہ یہ آدمی ایک ہی بار شاداں کے سامنے آیا تھا۔ اس سے پہلے وہ ایک بار اُس کے گھر آیا تھا۔

دوسری بار ان کی ملاقات اس طرح ہوئی کہ شاداں کھیتوں میں گئی ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنی زمین بٹائی پر دی ہوئی تھی۔ اُدھر سے یہ آدمی سردار علی جو شاداں کا امیدوار تھا، گھوڑے پر سوار آ گیا۔ اُس نے شاداں کے پاس گھوڑا روک کر اور گھوڑے سے اُتر کر اُسے کہا کہ وہ اُسی کے گھر آ رہا ہے، اچھا ہوا کہ شاداں اُسے یہیں مل گئی ہے۔ اُس نے شاداں کو ریشمی کپڑے دکھائے جو وہ اُس کے لئے لایا تھا۔

"جدھر سے آیا ہے اُدھر ہی چلا جا" — شاداں نے اُسے نفرت سے کہا — "میں تھوکتی ہوں تیرے اِن کپڑوں پر"۔

سردار علی معمولی آدمی نہیں تھا۔ گاؤں اور برادری میں اُس کی حیثیت معمولی نہیں تھی۔ اُس نے اپنے اوپر جبر کر کے شاداں کا دل جیتنے کی کوشش کی لیکن شاداں نے اُسے اور زیادہ ذلیل کر دیا اور کہا کہ وہ اُس کے گھر میں آیا تو وہاں بھی اُس کی بے عزتی کرے گی۔ جب شاداں کی زبان زیادہ توہین آمیز ہو گئی تو سردار علی غصے میں آ گیا۔

"تُو مجھ جیسے عزت دار آدمی کی بیوی نہیں بننا چاہتی" — سردار علی نے کہا — "تجھے نذیرے کی یاری پسند ہے"۔

"ہاں، مجھے نذیرے کی یاری پسند ہے" — شاداں نے کہا — "تُو نذیرے کی جُوتی کی بھی برابری نہیں کر سکتا۔ جا، میری ماں کے ساتھ شادی کر لے"۔

"نہ تُو زمین کے تختے پر نظر آئے گی نہ تیرا نذیرا!" — سردار علی نے کہا اور گھوڑے پر سوار ہو کر بولا — "اپنے آپ کو بھی اور اُسے بھی بچا کر رکھنا"۔

"یہ کب کی بات ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"تین چار روز ہو گئے ہیں" — شاداں نے جواب دیا۔

سردار علی میرا ایک اور مشتبہ بن گیا۔ مجھے یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ سردار علی کیسا آدمی ہے۔

"تھانیدار جی!" — شاداں نے بھکاریوں کے لہجے میں کہا — "اب میں آپ کو یہ نہیں کہوں گی کہ مجھے چھوڑ دیں۔ مجھے جیل خانے میں بھیج دیں، عمر قید دلا دیں۔ میری قسمت میں جوان اولاد والے بوڑھے ہی لکھے ہوتے ہیں اور دل کا پیار بھی دھوکہ ہی ہے تو اس دنیا میں رہ کر کیا کرنا ہے"۔

میرے پاس ان جذباتی باتوں کا وقت نہیں تھا۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو اس ڈیوٹی پر لگا رکھا تھا کہ ہر تین گھنٹے بعد ہسپتال جا کر نذیر کی رپورٹ لے اور مجھے بتاتے۔ ایک اور رپورٹ ملی کہ وہ ہوش میں ہے لیکن بولتا نہیں۔ دوسری رپورٹ ملی کہ گہری نیند سویا ہوا ہے۔ ڈاکٹر نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اب یہ خطرے سے باہر ہے۔

میں نے اے۔ ایس۔ آئی کو بلا کر کہا کہ سردار علی کے گاؤں کے نمبردار اور چوکیدار کو تھانے بلوالے۔ شاداں کو میں نے باہر بھیج دیا اور اُس کی ماں کو بلایا۔ اُس نے آتے ہی مظلومیت کی ایکٹنگ کی اور جو میں نے اس کا حال کیا وہ میں نہیں بتاؤں گا۔ اس عورت کو دیکھ کر میرے وجود میں آگ لگ گئی۔ ایک طرف یہ نمبردار کو کھارہی تھی، دوسری طرف سردار علی کو بیٹی دینے کا وعدہ کر کے اُس سے کھارہی تھی۔ وہ بات کرتی تھی تو میرے مُنہ سے گالیاں نکلنے لگتی تھیں۔

"تیری بیٹی مجھے سب کچھ بتا گئی ہے"— میں نے کہا —"تو جس طرح نمبردار کو اور پار والے سردار علی کو کھارہی ہے اور جُوتی کے متعلق تُو نے اور تیری بیٹی نے جو جھوٹ بولا تھا، وہ بھی بتا گئی ہے"۔

"کون سی جُوتی؟"— اُس نے ایک بار پھر معصوم اور انجان بننے کی کوشش کی۔

میں نے اُس کے مُنہ پر ویسا ہی تھپڑ مارا تھا جو اُس کی بیٹی کو مارا تھا۔ اس کے بعد اُس نے صحیح باتیں شروع کیں۔ اس کے لمبے چوڑے بیان کی مجھے ضرورت نہیں تھی۔ اس کی بیٹی کی دو چار باتوں کی تصدیق کرنی تھی۔

"میں جب تمہارے گاؤں میں تھا"— میں نے کہا —"اور شاداں کو میں نے نمبردار کی ڈیوڑھی میں بٹھایا ہوا تھا، اُس وقت نمبردار تمہارے گھر گیا تھا.... اُس نے تمہیں کیا کہا تھا؟ .... جھوٹ بولو اور اپنا حشر دیکھو"۔

"اُس نے جُوتی کی بات کی تھی"— اُس نے کہا —"کہتا تھا جُوتی پکڑی گئی ہے اور میں نے شاداں سے بیان دلوایا ہے کہ یہ جُوتی تمہاری نہیں۔ وہ

جُوتی تم شادی والے گھر پہن کر گئی تھیں اور وہاں کسی نے اُٹھا لی تھی"۔

"نمبردار تمہارے گھر کے پھیرے کیوں لگاتا رہتا تھا؟"

"آپ خود سیانے ہیں"— اُس نے کہا —"شاداں کے لئے آتا تھا"۔

"شاداں کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا؟"

"شادی نہیں جی!"— اُس نے جواب دیا —"بس، ویسے ہی اُسے چاہتا تھا"۔

اس طرح اُس نے سوالوں کے جواب دے دے کر شاداں کے سارے بیان کی تائید کر دی۔ شاداں کو تو میں نے عدالت میں گواہی کے لئے لے جانا تھا اور اس کی ماں سے نمبردار کے خلاف بیان لینا تھا۔ میں نے نمبردار کے خلاف رپورٹ تیار کر کے اُوپر بھیجنی تھی۔ یہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ نمبردار سرکاری آدمی ہوتے تھے۔ کسی نمبردار کو نمبرداری سے ہٹانا آسان نہیں ہوتا تھا۔

میں نے نمبردار کو بلا کر کہا کہ میں اُس کی نمبرداری ختم کرنے کے لئے رپورٹ لکھ رہا ہُوں۔ یہ سُن کر وہ تڑپنے لگا، معافیاں مانگنے لگا اور مجھے خوش کرنے کے لئے اُس نے جو کچھ مجھے پیش کیا اس کی فہرست ذرا لمبی ہے۔ اُس نے میرے کہے بغیر اپنے جُرم کا اقبال کر لیا۔ میں نے اُسے باہر نکال دیا۔

رات ختم ہو رہی تھی۔ شاداں کے بیان نے میرا دھیان اور میرا شک دوسرے گاؤں پہنچا دیا تھا۔ میں نے جن افراد کو کل سے اپنے ساتھ رکھا ہُوا تھا انہیں گاؤں چلے جانے کی اجازت دے دی۔ ان میں سیتا بھی تھی اور سکھ اور ہندو بدمعاش بھی۔ راجہ مراد خان اور جمال خان بھی تھے۔ شاداں اور اُس کی ماں کو تھانے میں ہی رہنے دیا اور میں خود تھوڑا سا سو لینے کے لئے گھر چلا گیا۔

جب میری آنکھ کھُلی تو سورج طلوع ہو چکا تھا۔ میں تیزی سے تیار ہو کر تھانے گیا۔ سردار علی کے گاؤں کا نمبردار اور چوکیدار آیا ہُوا تھا۔ میں ہسپتال چلا گیا اور ڈاکٹر سے ملا۔ ڈاکٹر نے اُسی شک کا اظہار کیا جو پہلے کر چکا تھا کہ مضروب کی یادداشت ختم ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر مجھے اُس کے پاس لے گیا۔ وہ جاگ رہا تھا۔

"مبارک ہو نذیر!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "خدا نے تمہیں نئی زندگی دی ہے۔"

وہ میری طرف دیکھتا رہا جیسے اُس نے میری بات سُنی ہی نہ ہو۔

"بوٹیں کہاں آتی ہیں نذیر!" ـــــ میں نے پوچھا۔

وہ پہلے کی طرح مجھے دیکھتا رہا۔

"خدا کا شکر ادا کرو کہ شاداں بھی بچ گئی ہے۔"

اُس نے ذرا سے ردِ عمل کا بھی اظہار نہ کیا۔

مختصر یہ کہ میں نے اور ڈاکٹر شرما نے کئی طریقے آزمائے، نذیر نہ بولا۔ اسے تازہ خون کافی دیا جا چکا تھا۔ ڈاکٹر شرما نے کہا کہ وہ آج کا دن اور رات دیکھے گا۔ اگر یہ بہتر نہ ہوا تو وہ سول سرجن کو رپورٹ بھیجے گا۔

"شادی کر کے دکھاؤں گا"

میں تھانے گیا اور سردار علی کے گاؤں کے نمبردار کو اپنے پاس بٹھا کر پوچھا کہ سردار علی کیسا آدمی ہے۔

"بڑی اچھی حیثیت کا آدمی ہے" ـــــ نمبردار نے کہا ـــــ "ہے تو راجہ جیسے دوسرے ہوتے ہیں لیکن اپنے آپ کو مہاراجہ سمجھتا ہے۔ ہر کسی کے دُکھ سُکھ میں پوری دلچسپی کے ساتھ شامل ہوتا ہے۔ کسی کو مدد کی ضرورت ہو تو دل کھول کر مدد کرتا ہے لیکن بات گردن اکڑا اکڑا کر کرتا ہے۔ سیدھی سادی بات کرنی ہو تو بھی لگتا ہے جیسے حکم دے رہا ہے ..... رنگین مزاج ہے۔ بال بچے دار ہوتے ہوئے خوبصورت عورتوں پر نظر رکھتا اور اُن تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اتنا زیادہ نہیں کہ لوگ اس پر انگلیاں اُٹھائیں۔ اپنا رُعب قائم رکھتا ہے۔"

"یہ باہر تم نے ایک لڑکی بیٹھی دیکھی ہے؟"

"دیکھی ہے جناب!" ـــــ نمبردار نے جواب دیا ـــــ "شاداں ہے نا!

راجہ مراد خان کی دوسری بیوی رہ چکی ہے۔ مراد کی بیٹی عابدہ ہمارے گاؤں میں بیاہی ہوئی ہے۔"

"ان کے گھر کا کیا حال ہے؟" ـــــ میں عابدہ اور اُس کی ساس کے آپس کے سلوک کے متعلق اپنی دلچسپی کے لئے معلوم کرنا چاہتا تھا ـــــ "کچھ پتہ ہے ساس بہو اب آپس میں کس طرح رہتی ہیں؟"

"اُن کے درمیان سے تو پانی بھی نہیں گزر سکتا" ـــــ نمبردار نے جواب دیا ـــــ "ساس بہو میں ماں بیٹی جیسا پیار ہے۔"

عابدہ نے اپنے باپ کے تین بیلوں کو زہر دے کر اپنی ساس کا پیار حاصل کیا تھا۔

"سُنا ہے سردار علی شاداں کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "یہ کہاں تک صحیح ہے؟"

"یہ سولہ آنے صحیح ہے" ـــــ نمبردار نے کہا ـــــ "شاداں کی ماں دو یا تین بار سردار علی کے گھر آ چکی ہے۔ آخری بار سردار علی کی بیوی نے اُس کی بے عزتی کر کے گھر سے نکالا تھا۔ سردار علی نے اپنی بیوی کے مُنہ پر دو تین تھپڑ جڑ دیئے۔ شاداں کی ماں تو چلی گئی لیکن پیچھے فساد چھوڑ گئی۔ سردار علی کی بیوی اپنے بھائیوں کے پاس گئی۔ اُس کے دو بھائی ہیں اور دونوں اتنے دلیر اور زبردست آدمی ہیں کہ کسی کو سر اٹھانے نہیں دیتے۔ وہ سردار علی پر جا دھمکے .....

"سردار علی بھی کم نہیں۔ اُس کا ایک بھائی ہے اور تین بھتیجے۔ وہ بھی آ گئے۔ سردار علی کا اپنا بیٹا سولہ سترہ سال کا ہے۔ وہ اپنی ماں کے خلاف ہو گیا۔ یہ میری برادری ہے۔ میں دوڑا گیا۔ کچھ اور آدمی آ گئے اور لڑائی نہ ہونے دی لیکن گالی گلوچ بہت ہوئی۔ سردار نے اعلان کر دیا کہ شاید میں دوسری شادی کا خیال دل سے نکال دیتا لیکن اب شادی کر کے دکھاؤں گا۔ اس گھر میں اب کرم بی بی کی بیٹی شاداں آئے گی .....

"شاداں تیرے گھر نہ آئے" ـــــ یہ اعلان سردار علی کے ایک سالے نے کیا۔ انہیں بڑی مشکل سے الگ کیا۔ میں نے اور میرے ایک بھائی نے رات

کو سردار علی کے گھر جا کر اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اپنی عمر دیکھے اور اپنی اولاد کا کچھ خیال کرے لیکن اُس نے ایک نہ سُنی۔ کہنے لگا اب تو ساری جائداد بیچنی پڑی تو بیچ دوں گا اور شاداں کو گھر لاؤں گا۔ اُدھر اُس کے سالے کہتے تھے کہ یہ شخص شاداں کو ڈھونڈتا پھرے گا۔"

"کیا سردار علی میں اتنی جرأت ہے کہ شاداں کو اُٹھا لاتے؟" ــــ میں نے نمبردار سے پوچھا۔

"اُس میں بہت جرأت ہے جی!" ــــ نمبردار نے جواب دیا ــــ "لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس لڑکی کو اُس نے اُٹھا لانے کے لئے کچھ کیا تھا یا نہیں۔"

اس نمبردار کو معلوم تھا کہ نذیر پر قاتلانہ حملہ ہُوا ہے لیکن یہ شاداں اور اُس کی ماں کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ شاداں بھی نذیر کے ساتھ تھی۔ میں نے نمبردار سے کوئی سراغ لینے کے لئے بہت کچھ پوچھا لیکن اُسے اور کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ اُسے اُٹھا کر میں نے چوکیدار کو بلایا۔ مجھے یہ خیال بھی آتا تھا کہ سردار علی اور اُس کے سسرال نمبردار کی برادری کے ہیں اس لئے وہ مُنہ سے کوئی ایسی بات نہیں نکالے گا جو اس کے اپنے آدمیوں کے خلاف جاتی ہو۔ چوکیدار کسی کا رشتہ دار نہیں تھا۔ وہ غریب نوکری کرنے والا آدمی تھا۔

سردار علی اور اُس کی دوسری شادی کے معاملے میں چوکیدار کو زیادہ معلوم نہیں تھا۔ اُسے یہ معلوم تھا کہ نذیر پر حملہ ہُوا ہے۔ اُس نے بتایا کہ سردار علی کی بیوی کے ایک بھائی کا یارانہ گاؤں کے ایک دو ایسے آدمیوں کے ساتھ ہے جو غنڈے اور بدمعاش ہیں اور ان میں ایک، ایک بار کا سزا یافتہ بھی ہے۔ چوکیدار نے یہ بھی بتایا کہ انہی جیسا ایک آدمی شاداں اور نذیر کے گاؤں کا بھی ان کے پاس آتا رہتا ہے۔

"کیا ان کا میل جول سردار علی کے ساتھ نہیں؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"ظاہری طور پر اُن کا میل جول ہر کسی کے ساتھ ہے" ــــ چوکیدار نے کہا ــــ "لیکن ان کی دوستی سردار علی کے ایک سالے کے ساتھ ہے۔ میں نے

دن کو ان دونوں آدمیوں کو دیکھا تھا۔ اُن کے ساتھ نذیر کے گاؤں کا ایک بدمعاش تھا۔ رات کو (واردات والی رات کو) اپنی گشت پر نکلا تو اچانک ایک بدمعاش سامنے آ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ میں نے رسمی طور پر اُس سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آ رہا ہے۔ اس نے کہا کہ جہاں کہیں سے بھی آ رہا ہوں، کسی کو بتانا نہیں کہ رات کو تم نے مجھے دیکھا تھا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ دشمن بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ خواہ مخواہ کوئی الزام لگا دیں گے۔"

چوکیدار معمولی ذاتوں کے غریب سے لوگ ہُوا کرتے تھے۔ ان کی یہ نوکری سرکاری ہوتی تھی۔ چونکہ وہ غریب لوگ ہوتے تھے جنہیں دیہات میں کمین اور کامے کہا جاتا ہے اس لئے اونچی ذاتوں والے انہیں اپنا نوکر سمجھتے تھے۔ ان پر حکم چلاتے تھے۔ اس چوکیدار کو گاؤں کا کمین اور کاما سمجھ کر اس بدمعاش نے جس کا نام بگّی تھا، اُسے حکم کے لہجے میں کہا کہ وہ کسی کو نہ بتائے کہ اُس نے اُسے کہیں سے آتے دیکھا تھا۔ بگّی کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔

"پھر جناب!" ــــ چوکیدار نے کہا ــــ "بگّی نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے اُلفے کو تو نہیں دیکھا؟ .... اُلفا بگّی کا جوڑی دار ہے۔ تین چار سال گزرے، وہ ایک آدمی کو زخمی کرنے کے جُرم میں پکڑا گیا تھا۔"

"کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہُوا تھا؟" ــــ میں نے پوچھا۔ میں اُس وقت اس تھانے میں ابھی نہیں آیا تھا۔

"لڑائی جھگڑا ہی سمجھو جناب!" ــــ چوکیدار نے جواب دیا ــــ "لیکن یہ لڑائی اس کی اپنی نہیں تھی۔ یہ بھی بگّی اور اُلفے کا پیشہ ہے کہ جو پیسے دے دے اُس کی لڑائی لڑنے چل پڑتے ہیں۔"

چوکیدار کی یہ بات سُن کر مجھے خوشی سی ہوئی۔ میں یہی سُننا چاہتا تھا کہ یہ دونوں غنڈے کرائے کی لڑائی لڑتے ہیں۔ یہاں مجھے سردار علی پر شک ہُوا کہ شاداں کو اٹھوانے کے لئے اُس نے ان غنڈوں کو استعمال کیا ہے لیکن میں یہ سوچ کر پریشان ہو گیا کہ سردار علی کو یا جس کسی نے بھی شاداں کو اٹھانے کی کوشش میں نذیر کو قتل کرنے کی کوشش کی ہے اُسے یہ کیسے معلوم ہُوا

کہ فلاں رات اور فلاں وقت نذیر اور شاداں فلاں جگہ موجود ہوں گے۔

چوکیدار نے میرے کہنے پر کہ وہ آگے کچھ بتاتے، بتایا کہ کچھ دیر بعد اُلفا بھی گاؤں آیا۔

"اُلفا سیدھا میری طرف نہ آیا" — چوکیدار نے کہا — "میں گلی میں تھا اور وہ گلی میں داخل ہُوا۔ پندرہ بیس قدم کا فاصلہ تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر رُک گیا اور دوسری طرف چل پڑا۔ میں نے اُسے آواز دی — 'آجا اُلفے! میں ہوں' — میں اُس کی طرف چلا اور وہ میری طرف آیا۔ میں نے اُسے کہا کہ بتی تمہارا ہی پوچھ رہا تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ بتی کو آئے کتنی دیر ہو گئی ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ تھوڑی ہی دیر ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا کہ اُس نے ایک بازو سینے پر رکھا ہُوا تھا اور اس بازو کو اُس نے سہارا دیا ہُوا تھا۔ وہ جب وہاں سے چلا تو اُس کے مُنہ سے ہلکی سی 'ہائے' نکل گئی .... جناب! میرے ناقص دماغ نے یہ سوچا کہ یہ جوا کھیلتے کسی کے ساتھ لڑ پڑے ہوں گے اور وہاں سے بھاگ آئے ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ اُلفا اچھی طرح چل بھی نہیں سکتا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ تکلیف میں ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی کسی نے خوب پٹائی کی ہے۔"

چوکیدار اپنی رائے کا اظہار کر رہا تھا لیکن میرا دماغ کہیں اور پہنچ گیا تھا۔ میرا دماغ کوئی معجزے نہیں دکھا رہا تھا۔ اس دماغ کو تفتیش کی ٹریننگ اور تجربہ ملا تھا۔ اس لئے یہ اشاروں پر کام کر رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ نذیر کے ہاتھ میں لاٹھی تھی اور شاداں نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ اس نے یکے بعد دیگرے اُن تین آدمیوں میں سے ایک کو دو تین لاٹھیاں ماری تھیں۔ مجھے شک ہُوا کہ نذیر کے حملہ آور یہی دو آدمی ہوں گے اور یہ سردار علی نے بھیجے ہُوئے تھے۔ تیسرا آدمی سردار علی خود ہو سکتا تھا۔

میں نے اُسی وقت سردار علی کو تھانے لانے کے لئے ایک کانسٹیبل کو دوڑا دیا اور میں ہسپتال چلا گیا۔ نذیر بالکل اُسی کیفیت میں تھا جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ اُس کے چہرے پر اب صحت مندی کے بڑے صاف اثرات تھے۔ اب اور زیادہ کوشش کی کہ وہ بات کرے لیکن وہ ایسے لگتا تھا جیسے بات سن ہی نہیں رہا، نہ سمجھ رہا ہے۔

ڈاکٹر شرما ابھی تک پُر امید تھا لیکن میرے لئے اچھی خاصی مشکل پیدا ہو رہی تھی۔

سالا صاحب

سردار علی ایک گھنٹے بعد پہنچ گیا۔ وہ اپنی گھوڑی پر آیا تھا اور جس طرح نمبردار نے بیان کیا تھا کہ وہ کس طرح اکڑا ہُوا رہتا ہے وہ اُس سے کچھ زیادہ ہی اکڑا ہُوا تھا۔ وہ اسی طرح اکڑ کر سارے تھانے پر رُعب جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اُسے اپنے دفتر میں لے گیا۔ اُس نے حاکموں کی طرح مجھ سے پوچھا کہ میں نے اُسے کیوں بلایا ہے۔ میں نے اُسے بیٹھنے کو کہا اور یوں کہا کہ تشریف رکھیں۔

"تشریف تو میں ضرور رکھوں گا" — اُس نے اور بڑا افسر بنتے ہوتے کہا — "پہلے مجھے یہ پتہ ہونا چاہیئے کہ مجھے تھانے میں کیوں بلایا گیا ہے"۔

"راجہ صاحب!" — میں نے بڑے تحمل سے کہا — "گردن کو ذرا ڈھیلا کر دیں اور آرام سے بیٹھ جائیں"۔

"لیکن کیوں؟" — اُس نے گردن کو کچھ اور اکڑا کر پوچھا۔

"میں کہتا ہوں بیٹھ جاؤ" — میں نے اتنی زور سے کہا کہ کمرہ گونج اُٹھا — "میں نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ اس بڑھاپے میں تم پرانی بیوی کو طلاق دے کر ایک جوان لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہو اور اس بات پر فساد ہُوا ہے اور تم نے ایک آدمی پر قاتلانہ حملہ کیا ہے اور جس لڑکی کو تم بیوی بنانا چاہتے ہو اُسے تم نے اغوا کرنے کی کوشش کی ہے"۔

"آپ غلط کہہ رہے ہیں" — اب وہ ذرا نرم لہجے میں بول رہا تھا۔

"پھر ثابت کرو کہ میں غلط کہہ رہا ہوں" — میں نے کہا — "تمہارے ساتھ میری کوئی دشمنی نہیں۔ میں تمہارے خلاف زبردستی کوئی الزام ثابت نہیں کروں گا۔ میرا شک رفع کر دو اور عزت سے رخصت ہو جاؤ اور ذہن میں بٹھا لو کہ یہ گاؤں نہیں تھانہ ہے۔ تم پولیس کے ہاتھ میں ہو۔ یہاں بڑے بڑے ڈاکوؤں کی بھی جھاگ بیٹھ جاتی ہے"۔

وہ جھاگ کی طرح کرسی پر بیٹھ گیا اور میں نے اُس سے پُوچھ گُچھ کچھ اس طرح شروع کر دی کہ بڑی تیزی سے اس پر سوال پر سوال کرتا گیا اور وہ میرے ہر شک اور الزام کی تردید کرتا گیا۔ میں نے جب اُسے کہا کہ وہ شاداں کے لئے کپڑے لایا تھا تو فلاں جگہ شاداں اُسے مل گئی اور اُس نے کپڑے اُس کے مُنہ پر مارے تھے اور اُس نے شاداں کو بڑی زوردار دھمکی دی تھی۔ سردار علی نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ ایسے ہُوا تھا لیکن اس نے ابھی یہ فیصلہ نہیں کیا تھا کہ وہ اپنی اس بے عزتی کا شاداں سے انتقام لے یا نہ لے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ اُس نے شاداں کو ذہن سے اُتار دیا تھا۔

"آپ نے اُسے ذہن پر سوار کیا ہی کیوں تھا؟" — میں نے ذرا شگفتہ سے لہجے میں کہا۔

وہ عجیب طرح ہنس پڑا۔ اس طرح وہ لوگ ہنسا کرتے ہیں جن میں عقل کی ذرا کمی ہوتی ہے اور وہ وقتی سے جوش میں آجایا کرتے ہیں۔

"یہ لڑکی میرے دل کو بالکل اُس طرح اچھی لگی تھی جس طرح ایک گھوڑی آپ کو اچھی لگے تو آپ پہلی گھوڑی بیچ کر نئی گھوڑی لے لیں" — اُس نے بڑی بے تکلفی کے لہجے میں جواب دیا — "یہ لڑکی میرے دل پر اس طرح قابض ہو گئی کہ میری عقل پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا" — وہ شگفتہ مُوڈ میں آگیا تھا لیکن اچانک سنجیدہ ہو گیا اور بولا — "آپ نے مجھ پر یہ شک کس بنا پر کیا ہے کہ میں نے شاداں کو اغوا کرنے کی کوشش کی ہے اور اُس کے یار پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ مجھے تو اب بھی معلوم نہیں کہ نذیر پر کہاں قاتلانہ حملہ ہُوا ہے اور اس لڑکی کو کہاں سے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔"

"ہتی اور اُلفا آپ کے دوست نہیں؟" — میں نے پوچھا۔

وہ یک لخت کرسی پر سیدھا ہو گیا اور میز پر دونوں کہنیاں رکھ کر میری طرف جُھکا۔

"کیا ہتی اور اُلفا اس واردات میں شامل تھے" — اُس نے پوچھا۔

"ہاں" — میں نے جواب دیا — "مجھے ابھی شک تھا لیکن میں یقین

کے لہجے میں بولا — "وہ دونوں اس واردات میں شامل تھے۔"

"پھر آپ میرے سالوں کو پکڑیں" — اُس نے پیچھے ہٹتے ہُوئے میز پر ہاتھ مار کر کہا — "یہ دونوں شخص میرے چھوٹے سالے کے گہرے یار ہیں۔ کچھ دن ہوتے میں نے ان کی بہن یعنی اپنی بیوی کو مارا پیٹا تھا تو اُس کی شکایت پر دونوں مجھے مارنے کے لئے آگئے تھے۔ اس کے بعد میں نے دو تین دفعہ دیکھا کہ میرا چھوٹا سالہ ہتی اور اُلفے کے ساتھ گھوم پھر رہا ہے۔ ایک آدمی نے جس بیچارے کی گاؤں میں کوئی ایسی بڑی حیثیت نہیں ہے ایک روز میرے کان میں کہا کہ ان لوگوں کی نیت ٹھیک نہیں۔ ان سے بچ کے رہنا۔"

"اس آدمی کو آپ تھانے لا سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں" — اس نے جواب دیا — "آپ ابھی اپنا آدمی بھیجیں اور وہ آجائے گا۔"

سردار علی نے بڑی تفصیل سے اپنی اکڑفوں اور حماقتوں کا اعتراف کیا اور اپنے سالوں اور سُسرال کے متعلق بتایا کہ وہ ہمیشہ اُس کے سر پر سوار رہنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس نے بہت سی دلیلیں دے کر مجھے بہت حد تک قائل کر لیا کہ یہ واردات اُس کے سالوں نے یا چھوٹے سالے نے کرائی ہے اور وہ صرف شاداں کو غائب کر کے سردار علی کے مُنہ پر ہاتھ پھیرنا چاہتے ہیں۔

میں نے ہیڈ کانسٹیبل اور ایک کانسٹیبل سے کہا کہ میری اور سردار علی کی گھوڑیاں لے کر فوراً سردار علی کے گاؤں جائیں اور اس کے دونوں سالوں کو اور ہتی اور اُلفے کو اس طرح ساتھ لائیں کہ وہ راستے میں ایک دوسرے کے ساتھ کوئی بات نہ کر سکیں۔ سردار علی کو میں نے کانسٹیبلوں کی بارک میں بٹھا دیا۔

تیسرا آدمی کون تھا؟

سردار علی کے دونوں سالے، ہتی اور اُلفا ڈیڑھ دو گھنٹے بعد اس

طرح تھانے میں داخل ہوتے کہ پہلے یہ دونوں غنڈے آتے اور دس پندرہ منٹ بعد ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ دونوں سالے آتے۔ میں نے دیکھا کہ اُلفا کا بازو اُس کے سینے پر تھا اور اُس نے ایک ہاتھ سے اس بازو کو سہارا دیا ہُوا تھا۔ اُس کے سر پر پگڑی کی بجائے کپڑا لپٹا ہُوا تھا۔ میں سب سے پہلے اُسے دفتر میں لے گیا اور دروازہ بند کر دیا۔

"الفے!" — میں نے اُسے بنچ پر بٹھا کر کہا — "تم سزا یافتہ ہو اور میرے سامنے پہلی بار آئے ہو۔ تمہارا ریکارڈ میرے پاس موجود ہے لیکن تم مجھے شاید نہیں جانتے۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ ایک ہی بار سچ کہہ دو۔"

"حکم حضور!" — اُس نے فدویوں کی طرح کہا — "ایک رتی جھوٹ نہیں بولوں گا۔"

اُس نے کُرتہ پہنا ہُوا تھا۔ میں نے اُس کے اُس بازو کی آستین پیچھے کی جسے اُس نے سینے پر رکھ کر دوسرے ہاتھ کا سہارا دیا ہُوا تھا۔ بازو پر کلائی سے کندھے تک کپڑا لپٹا ہُوا تھا اور کپڑے پر پیلے پیلے نشان تھے جو ہلدی کے معلوم ہوتے تھے۔ اُس دَور میں لوگ اسی قسم کی چیزیں علاج معالجے کے لئے استعمال کرتے تھے۔

"اور کہاں کہاں چوٹیں آئی ہیں؟" — میں نے پوچھا۔

"رات اندھیرے میں ایسا پاؤں پھسلا کہ میں پتھروں پر جا پڑا" — اُس نے مظلوم سے لہجے میں کہا۔

میں اُس کے ساتھ زیادہ سوال جواب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ سر سے کپڑا اور جسم سے قمیض اُتار دو۔ اُس نے کچھ دیر میرے مُنہ کی طرف دیکھ کر کپڑا اور قمیض اُتار دیے۔ اُس کا سر باریک مشین سے منڈا ہُوا تھا۔ سر پر اچھی خاصی ضرب کا نشان تھا۔

"کیا تمہارے سر پر اُس وقت پگڑی نہیں تھی؟" — میں نے اُس سے پوچھا — "یا تم یہ سمجھے تھے کہ نذیر خالی ہاتھ ہوگا۔"

اُس نے چونک کر میرے مُنہ کی طرف دیکھا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے اُس کے بازو سے کپڑا کھول کر فرش پر پھینک دیا۔

"لاٹھیاں ایک ہی بازو پر روکتے رہے ہو؟" — میں نے پوچھا — "اور سر پر لاٹھی کھا کر تم گرے نہیں؟"

اُس کی تو جیسے زبان ہی بند ہو گئی تھی۔ میں نے ہَوا میں ایک تیر چھوڑا۔

"اُلفے!" — میں نے بڑے اطمینان سے کہا — "میں کوئی جادوگر تو نہیں ہوں کہ تھانے میں بیٹھے مجھے اپنے آپ ہی اصل حقیقت معلوم ہو گئی ہو۔ نذیر بچ گیا ہے اور وہ رات کو ہی ہوش میں آگیا تھا۔ اُس نے تینوں میں سے صرف تمہیں پہچانا تھا۔ اس لئے میں نے تمہیں پہلی بات یہ کہی ہے کہ ایک ہی بار سچ بول دو۔ اگر سچ مجھے بولنا پڑا تو تمہاری سزا بھی عدالت میں جائے گی اور سزا اُدگنی دلاؤں گا۔"

اُس نے سر جھکا لیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اپنے جُرم کا اقبال کرنے کے مرحلے میں داخل ہو گیا ہے اور اب اُسے میری حوصلہ افزائی اور معافی کے جھوٹے سچے وعدوں کی ضرورت ہے۔ میں نے بڑی پیاری باتیں کر کے اُس کی یہ ضرورت پوری کر دی۔ اُس نے وعدہ معاف گواہ بننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے بے ایمان تھانیداروں کی طرح پکّا وعدہ کیا کہ اُسے وعدہ معاف گواہ بنا لیا ہے۔ اُس نے بیان دینا شروع کر دیا۔

سب سے پہلے اُس نے یہ انکشاف کیا کہ یہ واردات سردار علی کے چھوٹے سالے نے کرائی ہے لیکن وہ خود ساتھ نہیں تھا۔

"پھر تیسرا آدمی کون تھا؟"

اُس نے شاداں کے گاؤں کے آدمی کا نام لیا جو ذات کا کمہار اور کبڈی کا بڑا مشہور کھلاڑی تھا۔ اُلفے کے کہنے کے مطابق وہ اُلفے اور بجی کا اور سردار علی کے سالے ابرار کا دوست تھا۔ اکٹھے پیتے اور جوا بھی کھیلتے تھے۔ میں نے اُس سے وہ سوال پوچھا جو مجھے بہت پریشان کر رہا تھا کہ ان لوگوں کو کس طرح پتہ چلا کہ نذیر اور شاداں اس وقت فلاں جگہ موجود ہیں۔

"یہی تو وہ کھیل ہے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آیا" — اُلفے نے کہا —

"یہ خبر بھولے کمہار نے دی تھی۔ ہم نے شاداں کو اُس کے گھر سے اٹھانا تھا۔ اُس کے گھر میں اُس کی ماں اور باپ کے سوا کوئی نہیں تھا۔ تین آدمی بڑی آسانی سے اُس کے مُنہ پر کپڑا باندھ کر اُٹھا کر لا سکتے تھے۔ ہم نے بھولے کو بتایا تھا کہ ہم فلاں وقت آئیں گے ....

"ہم جب بتائے ہُوئے وقت پر شاداں کے گاؤں کے باہر پہنچے تو بھولا وہاں کھڑا ملا۔ اُس نے بتایا کہ خدا نے ہمارا کام آسان کر دیا ہے۔ وہ اس طرح کہ شاداں کو اس نے گاؤں سے باہر جاتے دیکھا تھا۔ اس نے تھوڑی دُور تک پیچھا کیا تو اسے کچھ دُور ایک آدمی کھڑا نظر آیا جسے وہ مدھم چاندنی میں اتنی دُور سے پہچان نہ سکا۔ وہ رُک گیا اور واپس آ گیا۔ اتنی دیر میں ہم آ گئے اور ہم تینوں اُس طرف چل پڑے جہاں شاداں اور وہ آدمی کھڑے تھے۔ ہم اُسے نہیں جانتے تھے کہ وہ کون ہے۔ بھولے نے بتایا کہ نذیر کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی دوستی صرف نذیر کے ساتھ ہے ....

"ہم تینوں اُس طرف گئے جدھر وہ گئے تھے۔ وہ ہمیں ایک خالی کھیت میں جو دوسرے کھیتوں سے نیچے تھا اکٹھے کھڑے نظر آ گئے۔ ہم نے صرف لڑکی کو اُٹھانا تھا۔ وہ آدمی نذیر تھا یا جو کوئی بھی تھا، اسے ہم نے ہاتھ بھی نہیں لگانا تھا لیکن وہ بھی آخر مرد کا بچہ تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ بغیر لڑے لڑکی ہمارے حوالے کر دیتا۔ ہم نے اُسے کہا بھی کہ وہ خاموشی سے اپنے گھر چلا جاتے اور لڑکی کو وہیں چھوڑ جاتے۔ میں آگے تھا۔ میں نے سر اور مُنہ پر رومال لپیٹا ہُوا تھا۔ اُس نے مجھ پر لاٹھی کا بڑا زور دار وار کیا جسے میں نے بازو پر روکا لیکن جتنا بازو پر لگا اتنا ہی میرے سر پر لگا۔ اگر یہ لاٹھی اتنی زور سے سیدھی میرے سر پر لگتی تو میں بے ہوش ہو کر گِر پڑتا۔ مجھے چکر آیا لیکن میں سنبھل گیا۔ اتنے میں اس نے دو لاٹھیاں اور ماریں جو میں نے اس بازو پر روکیں۔ ہڈی بچ گئی ہے لیکن اس بازو کا حال بُرا ہے ....

"میرے ساتھیوں نے اُسے مارنا شروع کر دیا۔ بنّی کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ اُس نے کلہاڑی ماری اور بھولے نے اُسے لاٹھیاں ماریں۔ میرے پاس

چاقو تھا جو نکالنے کا موقع ہی نہ ملا۔ نذیر کی لاٹھی بھی گِر پڑی تھی۔ ورنہ وہ اتنی جلدی مار نہ کھاتا۔ ہمیں پتہ ہی نہ چلا کہ لڑکی کدھر غائب ہو گئی ہے۔"

"ابرار نے یہ واردات کیوں کرائی تھی؟"

"اُس کا بہنوئی سردار علی اُس کی بہن کو طلاق دے کر شاداں کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "اس قصّے پر ان دونوں بھائیوں کی اور سردار علی کی گالی گلوچ بھی ہوتی تھی اور سردار علی نے کہا تھا کہ اب وہ شادی کر کے ہی دکھائے گا۔ ابرار نے ہمیں کہا کہ اس لڑکی کو غائب کرنا ہے۔ پہلے اسے خراب کریں گے پھر کہیں غائب کر دیں گے۔ پھر سردار علی سے کہیں گے کہ جاؤ اس لڑکی کو ڈولی میں بٹھا کر لے آؤ۔"

"تم نے ابرار سے کیا وصول کیا ہے؟"

اُس نے ایک ایک سو روپیہ بتایا جو آج کے پانچ چھ ہزار روپے کے برابر رقم تھی۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ اُن کی اُجرت میں شاداں بھی شامل تھی۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ ایک کانسٹیبل کو ہتھکڑی دے کر شاداں کے گاؤں بھیج دیا کہ کبڈی کے کھلاڑی بھولے کمہار کو باقاعدہ گرفتار کر کے لے آئیں۔ میں نے اس دوران بنّی کو بلایا اور اُسے کہا کہ بیان ہو چکا ہے۔ اب وہ سچ بول دے۔ اُس نے تھوڑا سا پریشان کیا لیکن میرے صرف دو تھپڑوں نے اُس کا دماغ درست کر دیا۔ اُس نے بالکل یہی بیان دیا جو اُلفا دے چکا تھا۔ پھر میں نے ابرار کو بلایا۔ اُس نے بھی جرم ماننے سے انکار کیا لیکن میں نے جب اسے بتایا کہ مجھے سب کچھ پتہ چل گیا ہے تو وہ بولنے پر آ گیا۔

"ابرار بھائی!" ــــ میں نے کہا ــــ "یہ جواری اور بدمعاش لوگ پولیس کے وفادار ہوتے ہیں۔ تم نے غلط لوگوں پر اعتبار کیا ہے۔"

"ملک صاحب!" ــــ اُس نے درخواست کے لہجے میں کہا ــــ "کیا آپ کو یہ معلوم نہیں کہ اس فساد کی اصل وجہ کیا ہے؟"

"مجھے معلوم ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "تم سردار علی کو ذلیل کرنے کے لئے اُس لڑکی کو غائب کرنا چاہتے تھے جس کے ساتھ وہ شادی

کر رہا تھا۔"

"ابھی نہیں ملک صاحب!" — اُس نے کہا — "اُس نے ہماری بہن کو مارا اور ہماری بے عزتی کی ہے۔ پھر للکار کر کہا کہ میں تمہاری بہن کو ضرور طلاق دوں گا اور دوسری شادی کر کے دکھاؤں گا۔"

"تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا" — میں نے کہا — "لیکن بات جب پولیس کے پاس پہنچ جاتی ہے تو پھر اسے کسی اور رنگ میں دیکھا جاتا ہے۔"

"کیا آپ میری عزت کا کچھ خیال کریں گے؟" — ابرار نے پوچھا — "خود ہی غور کریں کہ اس عمر میں اگر یہ شخص ہماری بہن کو طلاق دے رہا ہے۔ ہمارا باپ ضعیفی کی حالت میں ہے۔ وہ اس صدمے سے ہی چارپائی پر لگ گیا ہے۔ اب اگر مجھے سزا ہو گئی تو وہ میری گرفتاری کا صدمہ ہی برداشت نہیں کر سکے گا۔"

اُس نے اس طرح کی اور بھی بہت سی جذباتی باتیں کیں جن سے میں متاثر بھی ہوا لیکن میں اُسے بخش نہیں سکتا تھا کیونکہ اس نے اُس لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی جس کا کوئی قصور نہیں تھا اور اُس آدمی کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی جو اُن لوگوں کا مجرم نہیں تھا البتہ ابرار کے بچنے کے امکانات بہت روشن تھے۔ ملزموں کا یہ کہنا کہ اُنہوں نے فلاں جرم فلاں کے کہنے پر کیا ہے اُس آدمی کو سزا نہیں دلا سکتا بلکہ اُسے گرفتار تک نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ ٹھوس ثبوت اور شہادت موجود نہ ہو۔ میں نے ابرار کو حراست میں نہ لیا۔ اُسے تھانے میں بٹھا لیا۔ میں نے یہ دیکھنا تھا کہ اُس کے خلاف کوئی ثبوت ہے یا نہیں۔ اس نے انکار نہیں کیا کہ اُس نے یہ واردات کرائی ہے لیکن یہ بھی اُسے گرفتار کرنے کے لئے ناکافی تھا۔

کچھ دیر بعد شاداں کے گاؤں کا بھولا بھی، ہتھکڑیوں میں بندھا ہوا آ گیا۔ میں نے ہتھکڑی کھلوا کر اُسے اپنے پاس بٹھا لیا اور اُسے بتایا کہ وہ اقبالِ جرم کر لے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اُسے میں نے ویسے ہی گرفتار نہیں کیا۔ وہ سمجھ گیا

کہ راز کھل گیا ہے۔ اُس نے اقبالِ جرم کر لیا۔ اُس نے بتایا کہ وہ دوسرے گاؤں سے آنے والے بجی اور اُلفے کا انتظار کر رہا تھا۔ اُسے گاؤں میں سے کوئی نکلتا نظر آیا۔ وہ پیپل کے درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ آنے والا اُس کے قریب سے گزرا۔ اُس نے صاف پہچان لیا کہ یہ تو شاداں ہے۔ بھولا اُس کے پیچھے گیا۔ کچھ دُور اُسے ایک آدمی کھڑا نظر آیا۔ شاداں اُس سے جا ملی اور وہ دونوں اور آگے چلے گئے۔ بھولا واپس اپنی جگہ آ گیا اور اُس کے ساتھی آ گئے۔ آگے اُس کا بیان وہی تھا جو بجی اور اُلفا دے چکے تھے۔

میں نے تینوں کے اقبالِ جرم مجسٹریٹ سے قلم بند کروا کے تینوں کو جوڈیشل حوالات میں بھجوا دیا۔ ابرار کے خلاف میری کوشش کے باوجود کوئی شہادت نہ ملی جس کے زور پر میں اُسے گرفتار کرتا۔ میں نے اس خیال سے کہ ملزم عدالت میں جا کر اپنے اقبالی بیانات سے منحرف ہو جائیں گے، شہادت مکمل تیار کی اور ایک ہفتے کے اندر اندر چالان عدالت میں پیش کر دیا۔

نذیر کی کیفیت وہی رہی۔ شدید ضربات سے وہ یادداشت سے محروم ہو چکا تھا اور اُس کی بولنے کی صلاحیت بھی اتنی مجروح ہو گئی تھی کہ ذرا سی سرگوشی کرتا تھا جو سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ مقدمہ تقریباً تین مہینے چلا۔ قصبے کے ڈاکٹر شرما نے اور ضلع کے سول سرجن نے بھی گواہی دی کہ شدید ضربات سے مضروب یادداشت اور بولنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے۔ نذیر کو عدالت میں پیش کیا گیا تھا۔ اُس نے تینوں ملزموں کو دیکھا لیکن وہ چُپ رہا۔

آخر تینوں کو دفعہ ۳۰۷ کی انتہائی سزا سات سات سال قید بامشقت دی گئی اور ابرار محفوظ رہا۔ شاداں کے گاؤں کے نمبردار کو میری رپورٹ نمبرداری سے تو نہ ہٹا سکی لیکن اُسے بڑی سخت وارننگ دی گئی۔

ساس، سوتیلی ماں اور سسر سول

قتل تو انسان ہی ہُوا کرتے ہیں لیکن اس کیس میں تین بیل قتل ہو گئے تھے۔ انہیں زہر دیا گیا تھا۔ میں اُس وقت دیہاتی علاقے کے ایک تھانے کا ایس۔ ایچ۔ او تھا اور علاقہ پنجاب کا اور مسلمانوں کی اکثریت کا تھا۔ اپنی کہانیوں میں اکثر دیہات کے لوگوں کی آپس کی دشمنی کا ذکر کرتا ہوں۔ یہ خاندانی عداوتیں ہیں جو اُس زمانے سے پہلے کسی زمانے میں شروع ہوتی تھیں اور ابھی تک چل رہی ہیں۔ دیہات میں ہی نہیں، قصبوں اور شہروں میں بھی خاندانی رنجشیں موجود ہیں۔ فرق یہ ہے کہ دیہات کے لوگ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اُن کی باتیں زبان سے کم اور لاٹھی کلہاڑی سے زیادہ ہوتی ہیں۔ شہروں میں لڑائی جھگڑے کم اور فریب کاری زیادہ ہوتی ہے۔ دشمن کو خفیہ اور گھٹیا طریقے سے نقصان پہنچایا جاتا ہے۔

میں جس وقت کی اور پنجاب کے جس ضلعے کی کہانی سُنا رہا ہوں وہ ضلع خاندانی عداوتوں کے لئے مشہور تھا اور اُس وقت وہاں قتل اور انتقامی قتل کا سلسلہ چلتا ہی رہتا تھا۔ میں اُس ضلعے کا اور اس واردات میں پکڑے جانے والے اور اس واردات کی زد میں آنے والے لوگوں کے نام لکھ کر انہیں رُسوا نہیں کرنا چاہتا۔

ناموں کے ساتھ آپ کو دلچسپی نہیں ہونی چاہیئے۔ میں آپ کو ایسی کہانی سُنا رہا ہوں جس میں میری پہلی کہانیوں جیسی سراغرسانی نہیں ہو گی۔ یہ انسانی فطرت اور جذبات کی کہانی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک مجبور اور بے کس انسان کیا کچھ کر گزرتا ہے۔

تین آدمی نمبردار کے ساتھ تھانے میں یہ رپورٹ لے کر آتے کہ صبح ان کا نوکر مویشیوں کو چارہ ڈالنے گیا تو دیکھا کہ تین بَیل مَرے پڑے ہیں۔ یہ تینوں ایک ہی کھُرلی پر بندھے ہوتے تھے۔ ان میں ایک بَیل زیادہ قیمتی تھا۔ سال میں ایک مرتبہ چند دنوں کے لئے گورنمنٹ انتظام کے تحت مویشیوں کا میلہ لگا کرتا تھا۔ انگریز ڈپٹی کمشنر اور کمشنر وغیرہ مویشیوں کی افزائش پر بہت توجہ دیتے اور لوگوں کو اچھی نسل کے مویشی پالنے کی عملی ترغیب دیا کرتے تھے۔

یہ بَیل جو دو بیلوں کے ساتھ مارا گیا تھا، بہت اچھی نسل کا تھا اور چھ سات مہینے پہلے اُس نے میلے میں انعام حاصل کیا تھا۔ دوسرے بَیل بھی بڑے اچھے تھے اور یہ ہل وغیرہ کے لئے استعمال ہوتے تھے۔

ان کے مالک جو تھانے میں میرے سامنے بیٹھے تھے، میرے جانے پہچانے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ایک گاؤں کے ایک خاندان کے ساتھ ان کی بڑی پرانی دشمنی ہے۔ پولیس کی زبان میں انہیں معزز کہا جاتا تھا۔ کرتُوت کے لحاظ سے یہ ذرا سے بھی معزز نہیں تھے۔ یہ اعلیٰ ذات کے لوگ تھے۔ ان کی کھیتیاں سونا اُگلتی تھیں۔ زیادہ تر عداوتیں انہی لوگوں کے درمیان ہوتی تھیں کیونکہ ان کے پاس فالتو پیسہ ہوتا تھا جو وہ مقدمہ بازی پر خرچ کیا کرتے تھے۔

"راجہ صاحب!" ــــ میں نے انہیں کہا ــــ "آپ لوگ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔ آپ نے اُن کے دو بیلوں کو زہر دیا تھا۔ اب وہ آپ کے تین بَیل مار گئے ہیں۔"

"وہ تو ہم نے ثابت کر دیا تھا کہ اُن کے بیلوں کو ہم نے زہر نہیں دیا" ــــ بَیل والے بڑے راجہ نے کہا ــــ "اس کے بعد راضی نامہ بھی ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ہم نے اُن کے خلاف بات تک نہیں کی۔"

"اتنے سیدھے نہ بنیں جناب!" ــــ میں نے کہا ــــ "میں نے راضی نامہ کرا دیا تھا اور آپ کو صاف بچا لیا تھا۔"

"میں نے تو سرکار، اپنی بیٹی کا رشتہ انہیں دے دیا تھا" ــــ اس بزرگ نے کہا ــــ "میری بیٹی اُن کے گھر ہے۔ پھر بھی اُنہوں نے کوئی خیال نہیں کیا۔ راضی نامہ اُنہوں نے توڑا ہے۔ اُن کے خلاف کارروائی ہونی چاہیئے۔"

"آپ شک میں کس کا نام لکھوائیں گے؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"انہی کے نام لکھیں" ــــ اس نے کہا ــــ "اُن کے سوا ہمارا اور کوئی دشمن ہے ہی نہیں۔"

یہ سُن کر مجھے غصہ آیا۔ اس شخص نے راضی نامے کو اس طرح پکا کیا تھا کہ اپنی بیٹی کو اُن کے بیٹے کے ساتھ بیاہ دیا تھا۔ یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ اس سے مجھے خیال آیا کہ میں جس خاندان پر شک کر رہا ہوں وہ اس جرم کا مجرم نہیں۔ یہ واردات کسی اور نے کی ہوگی۔ واردات بہرحال انتقامی کارروائی تھی۔

پہلے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ یہ قصہ کیا ہے۔ اس گاؤں سے ایک میل دُور یا ایک دو فرلانگ زیادہ دُور ایک اور گاؤں تھا۔ وہاں دو خاندان انہی کی ذات اور برادری کے تھے۔ دونوں گاؤں کے درمیان جو کھیت تھے وہ اسی برادری کے تھے، یعنی ان کھیتوں میں اُن لوگوں کے کھیت بھی تھے جو بیلوں کی زہرخورانی کی رپورٹ لے کر آتے تھے۔ ان کے کھیت گڈمڈ تھے، مثلاً ایک فریق کے کچھ کھیت دوسرے فریق کے گاؤں کے قریب تھے اور اُس فریق کے اِس فریق کے گاؤں کے ساتھ۔

کھیت اور فصل اکٹھے ہوں بلکہ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوں تو لڑائی جھگڑے کے بہانے مل جاتے ہیں، مثلاً ایک فریق کا بَیل یا بھینس یا کوئی جانور دوسرے فریق کے کھیت میں چلا گیا اور کھیت والے نے جانور کو لاٹھی، ڈنڈہ یا پتھر مار کر باہر نکالا تو جانور کے مالک مشتعل ہو گئے اور تُو تُو مَیں مَیں ہو گئی جو لڑائی کی صورت اختیار کر گئی۔ اس کے علاوہ بھی کئی وجوہات ہوتی ہیں۔

بیس پچیس سال پہلے دونوں فریقوں کے آدمیوں کی کھیتوں میں معمولی سی کسی بات پر لڑائی ہو گئی تھی اور ایک آدمی قتل ہو گیا تھا۔ تین آدمیوں کے خلاف قتل کا مقدمہ چلا اور تینوں بری ہو کر گھر آ گئے۔ ایک مہینے بعد ان میں سے ایک آدمی قتل ہو گیا اور دوسرے فریق کے دو آدمی پکڑے گئے۔ دونوں

کو سزائے عمر قید ملی۔ اس کے بعد دونوں فریقوں کے درمیان لڑائیاں ہوتی رہیں اور راضی نامہ بھی ہوتا رہا۔ دو تین مرتبہ تھانے میں بھی ان کے کیس آئے۔ چونکہ قتل کوئی نہیں ہوا تھا اس لئے تھانیداروں نے اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے ہر بار راضی نامہ کرا دیا۔

راضی نامہ جب بھی ہوتا تھا، اس میں یعنی راضی نامہ کرانے والوں میں دونوں فریقوں کا پیر اور دونوں گاؤں کے پیش امام بھی ہوتے تھے اور دعائے خیر بھی ہوتی تھی۔ رشتے بھی لیتے اور دیئے جاتے تھے پھر لڑنے جھگڑنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ مل جاتا تھا۔ دشمنی دلوں میں زندہ رہتی تھی۔ اس کی سب سے زیادہ زد عورتوں پر پڑتی تھی۔ دشمنی کی بنا پر ایک دوسرے کی شادی شدہ عورتوں کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا جاتا تھا۔ نہ انہیں بسایا جاتا نہ اُجاڑا جاتا۔ ماں باپ کے گھر بٹھا دیا جاتا اور طلاق نہ دی جاتی۔

یہ سلسلہ ان دونوں فریقوں میں چل رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی خوشی اور غمی میں شریک ہوتے تھے لیکن خوشی کے موقع پر اندر سے مغموم اور غم کے موقع پر اندر سے خوش ہوتے تھے۔

اِن کی بیٹی اُن کا بیٹا

ایک سال پہلے، میں اس تھانے میں نیا نیا آیا تھا۔ دوسرے گاؤں کے تین چار آدمی تھانے میں رپورٹ لکھوانے آئے تھے کہ اُن کی ایک بھینس اور ایک بَیل کو رات کے وقت کسی نے زہر دے کر مار ڈالا ہے۔ انہوں نے شک ان لوگوں پر لکھوایا تھا جو اَب، ایک سال بعد میرے سامنے بیٹھے کہہ رہے تھے کہ اُن کے تین بَیل زہر خورانی سے مارے گئے ہیں۔ ایک سال پہلے جب بَیل اور بھینس کے مرنے کی رپورٹ آئی تو مجھے پہلی بار ان کی دیرینہ دشمنی کا پتہ چلا تھا۔

میں نے دونوں گاؤں کے نمبرداروں، ذیلداروں اور معززین سے تفصیلات معلوم کی تھیں۔ دونوں فریقوں کے سرکردہ آدمیوں کو الگ الگ بلا کر پوچھا تھا۔

مخبر اور تھانے کے پرانے ملازموں سے بھی پوچھا تھا۔ مزید تفتیش کی ضرورت نہیں تھی۔ جن پر بَیل اور بھینس کو زہر دینے کا شُبہ کیا گیا تھا، انہیں بلا کر میں نے تھانے میں بہت ذلیل کیا تھا۔ انہیں پانچ چھ دن اور راتیں تھانے میں رکھا تھا۔ انہیں مزید ذلیل کرنے کے لئے اُن کی دو تین عورتوں کو بھی بلا لیا اور انہیں بھی پریشان کیا تھا۔

بَیل اور بھینس والوں کو بھی میں نے تھانے کے ایسے چکر دیئے تھے کہ وہ بلبلا اُٹھے تھے۔ میں جانتا تھا کہ زہر دینے والوں کا سراغ نہیں ملے گا۔ یہ جانتے ہوئے کہ زہر دینے والا فلاں اور فلاں ہے لیکن اُن کے خلاف جُرم ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں جو شاید پہلے بھی کبھی بتایا ہے کہ دشمنی میں دیہاتی لوگ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کا یہ طریقہ بھی اختیار کیا کرتے تھے کہ فصل کٹ کر کھلیان میں آجاتی اور جب سوکھ جاتی تھی تو دشمن چوری چھپے جا کر آگ لگا آتے تھے۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ ایک دوسرے کے مویشیوں کو زہر دے دیا جاتا تھا۔

میں نے بَیل اور بھینس کی زہر خورانی کی تفتیش اس طرح کی جیسے اُوپر بیان کیا ہے۔ دونوں فریقوں کو تھانے کے چکر دے دے کر بے حال کر دیا اور ایک دن جب دیکھا کہ ان کے دماغ درست ہو گئے ہیں تو انہیں اکٹھے بٹھا لیا۔ ان کے خاندانوں کے دوسرے آدمیوں کو بھی بلا لیا۔ میں نے انہیں اُن کی پوری ہسٹری سنائی کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف اب تک کیا کیا جُرم کر چکے ہیں۔ یہ تو بڑے بڑے جرائم تھے۔ میں نے انہیں ان کی چھوٹی چھوٹی حرکتیں بھی سنائیں۔

"کیا تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ مجھے معلوم نہیں کہ بَیل اور بھینس کو زہر کس نے دیا ہے؟" ــــ میں نے کہا اور اُن سے مخاطب ہوا جن کا یہ نقصان ہوا تھا۔ میں نے انہیں کہا ــــ "تم ایک بَیل اور ایک بھینس کے مارے جانے پر میرے پاس دوڑے آتے ہو۔ گریبان میں مُنہ ڈالو اور یاد کرو کہ تم ان کا اب تک کتنا نقصان کر چکے ہو جن پر تم اپنے دو مویشیوں کی ہلاکت کا شُبہ کرتے ہو۔"

اگر اپنی عزت کو عزیز سمجھتے ہو تو اپنے مویشیوں کو بھول جاؤ۔ اگر نہیں تو میں تمہارے پچھلے جرم آگے رکھ لوں گا اور ایسا رگڑا دوں گا کہ ساری عمر ایک دوسرے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھو گے۔"

پھر میں نے سب سے کہا — "تم اعلیٰ ذاتوں کے لوگ ہو اور اپنے سے چھوٹی ذاتوں والوں کو تم انسان بھی نہیں سمجھتے۔ میں تمہیں انہی لوگوں کے سامنے ذلیل اور خوار کر دوں گا۔ دونوں فریقوں کے دو دو تین تین آدمیوں کو دس نمبر میں لکھ لوں گا۔ تم جانتے ہو دس نمبر تیا کیا ہوتا ہے .... میں تمہیں راضی نامے کا آخری موقع دیتا ہوں۔ اس کے بعد تم میں سے کسی نے دوسرے کے خلاف ذرا سی بھی حرکت کی تو سب کو اندر کر دوں گا۔ میں تمہاری اُن عورتوں کو بھی جانتا ہوں جو مردوں کے کان بھرتی رہتی اور فساد کراتی ہیں۔ سب سے پہلے انہیں حوالات میں بند کروں گا۔ میں اُن تھانیداروں میں سے نہیں ہوں جو دونوں طرف سے گھی اور مکھن کھاتے رہتے ہیں۔ میں تمہارے دماغ درست کر دوں گا یا پاگلوں کی طرح چیختے چلاتے پھرو گے۔"

ایسی اور بھی بہت سی باتیں کہہ کر میں نے انہیں ایسا ڈرایا تھا کہ وہ راضی نامے پر رضامند ہو گئے۔ اب میں نے اُن کے پیر اور اماموں کو اس میں شامل نہ کیا۔ ایک تحریر لکھ کر اس پر اُن کے انگوٹھے لگوا لئے تھے۔ اس کے بعد میں دوسرے تیسرے مہینے ان کے بڑوں کو تھانے بلا کر پوچھتا تھا کہ اُن کے حالات کیسے جا رہے ہیں۔ سب خیریت رہی۔ آخر ایک سال بعد دوسری پارٹی آ گئی۔ ان کے تین بیل زہر سے مارے گئے تھے۔ میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ اب پوری تفتیش کروں گا۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ زہر خورانی کے ملزموں کو تو پکڑ لوں گا لیکن جرم ثابت کرنا ممکن نہیں ہو گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ جھوٹی شہادت ڈال کر جرم ثابت کر دوں گا جسے پیڈنگ کہتے ہیں۔

میں انہیں ساتھ لے کر ان کے گاؤں چلا گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل کو ایک کانسٹیبل دے کر ان کے مخالف گاؤں اس کام کے لئے بھیجا کہ جن پر شک کیا گیا ہے انہیں واردات والے گاؤں میں لے آئے۔ مجھے ایک شک تھا کبھی

ایسے بھی ہو جاتا ہے کہ مویشی کوئی زہریلی بوٹی کھا لیتے ہیں۔ تینوں بیل ایک کھرلی پر بندھے تھے۔ انہوں نے ایک ہی چارہ کھایا تھا۔ ممکن تھا کہ چارہ کسی اور وجہ سے زہریلا ہو۔

میں راستے میں ان سے مزید معلومات لیتا گیا۔ یہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ان لوگوں نے اپنی بیٹی اُن لوگوں کے بیٹے کو دی تھی جن پر انہوں نے شک لکھوایا تھا۔

عورتیں ہوتی ہی فسادی ہیں

واردات والی حویلی خاصی بڑی تھی۔ اس کے ساتھ دو کمرے اور تھے۔ ان کے آگے برآمدہ اور آگے صحن تھا۔ صحن میں بیری اور شہتوت کے درخت تھے۔ صحن کی دیوار خاصی اونچی تھی۔ یہ مویشیوں کی جگہ تھی۔ کمرے بھی مویشیوں کے لئے تھے۔ صحن میں دو کھرلیاں تھیں۔ ایک کے پاس تین بیل مرے پڑے تھے۔ جس بیل نے انعام لیا تھا، اسے مرا ہوا دیکھ کر مجھے افسوس ہوا۔ میں خود دیہاتی زمیندار تھا۔ میں جانتا تھا کہ اچھے مویشی کی قدر و قیمت کیا ہوتی ہے۔ یہ تو بہت خوبصورت، تندرست اور جوان بیل تھا۔ یہ ان لوگوں کی عداوت کی نذر ہو گیا تھا۔

دوسری کھرلی پر ایک گھوڑا اور ایک بھینس بندھے ہوتے تھے۔

میں نے سب سے پہلے مرے ہوتے بیلوں کی کھرلی میں چارہ دیکھا۔ بہت تھوڑا چارہ تھا۔ مزید چارہ صبح ڈالنا تھا لیکن بیل مر چکے تھے۔ چارے میں سرسوں کے چند ایک ہرے پتے بکھرے ہوتے تھے۔ چارہ نوکر ڈالا کرتا تھا۔ نوکر وہیں تھا۔ مجھے ہرے پتے کچھ عجیب لگے۔

"سرسوں کے پتے بھی چارے میں ملایا کرتے ہو؟" — میں نے نوکر سے پوچھا۔

"نہیں جی!" — اُس نے جواب دیا — "یہ میں نے نہیں ڈالے۔"

"اور بھی کوئی انہیں چارہ ڈالا کرتا ہے؟"

"نہیں جی!" — نوکر نے جواب دیا — "صرف میں ہوں۔ یہ میرا کام ہے۔"

میرے پوچھنے پر بتایا گیا کہ یہ نوکر رات کو یہیں سوتا ہے اور رکھوالی والا کتا رات کو حویلی کے باہر رہتا ہے۔

میں نے ان لوگوں سے کہا کہ بیل گاڑی کا انتظام کریں۔ مرے ہوئے بیلوں کو شہر پوسٹمارٹم کے لئے بھیجنا تھا اور کچھ چارہ لیبارٹری ٹیسٹ کے لئے بھیجنا تھا۔ اسے لاہور جانا تھا۔ جانوروں کا پوسٹمارٹم کرنے والا ویٹرنری ڈاکٹر جو سلوتری کہلاتا تھا، گاؤں سے پانچ میل دور قصبے میں ہوتا تھا۔

میں نے اس گھر کے بڑے آدمی، راجہ مراد خان، سے کہا کہ گھر میں سب سے پوچھے کہ بیلوں کے چارے میں سرسوں کے پتے کس نے پھینکے تھے۔ تھوڑی دیر بعد مجھے جواب ملا کہ گھر میں کھیتوں سے سرسوں کا ساگ آیا تھا اور گزشتہ شام بھی پکا تھا۔ اس سے اتنے پتے بچے ہی نہیں تھے کہ بیلوں کے آگے پھینک دیئے جاتے۔

میں نے دوسری کھرلی کا چارہ دیکھا۔ وہاں سرسوں کے پتے نہیں تھے۔ میرا ذہن ان پتوں میں اٹک گیا تھا۔

میں نے دیوار اور دروازے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ نوکر کہتا تھا کہ دروازہ اندر سے بند تھا۔ صبح وہ اٹھا تو بھی اس کی زنجیر چڑھی ہوئی تھی۔ دیوار کو میں نے پہلے اندر سے بڑی غور سے دیکھا۔ ایسا کوئی نشان نظر نہ آیا جس سے پتہ چلتا کہ یہاں سے کوئی دیوار سے اترا ہے۔ باہر جا کر دیوار کا انچ انچ دیکھا۔ ادھر بھی کوئی نشان نہیں تھا۔ دروازے کی زنجیر دیکھی۔ یہ باہر سے نہیں کھل سکتی تھی۔ اگر باہر سے کوئی نہیں آیا تھا تو اس نوکر کو اس کام کے لئے استعمال کیا گیا ہوگا۔ ادھر گلی تھی جس میں سے انسان اور مویشی گزرتے رہتے تھے اور ابھی تک گزر رہے تھے، اس لئے کھرا ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

دو بیل گاڑیاں آگئیں۔ بہت سے آدمیوں نے مل کر مرے ہوئے دو بیلوں کو ایک پر اور ایک کو دوسری بیل گاڑی پر لادا اور ان کی چیر پھاڑ کے

لئے لے گئے۔ میں نے چارے کی کچھ مقدار اور سرسوں کے چار پانچ پتے اس حکم کے ساتھ تھانے بھجوا دیئے کہ انہیں لاہور بھیجنے کے لئے تیار کریں۔ اس کام کے لئے کچھ دفتری کارروائی کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ آپ کو دلچسپی نہیں ہونی چاہئے۔

مرے ہوئے بیل لے گئے تو میں کھرلی کے پاس گیا۔ وہاں ایک کاغذ پڑا ہوا تھا۔ یہ کسی اردو اخبار کا ٹکڑا تھا۔ تقریباً پانچ انچ لمبا اور اتنا ہی چوڑا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ پڑیا بنی ہوئی تھی اور اسے کھولا گیا ہے۔ زہر کے سوا اس میں اور کیا ہو سکتا تھا۔ زہر اسی میں لپٹا ہوا تھا۔ میں نے کاغذ کو غور سے دیکھا۔ اس کے ساتھ مجھے زہر لگا ہوا نظر نہ آیا پھر بھی اسے تہہ کر کے (جس طرح پہلی تہوں کے نشان تھے) تھانے بھیج دیا کہ یہ بھی لاہور بھیجا جائے۔ میں نے کاغذ کو ذہن میں رکھ لیا۔

میں نمبردار کے گھر جا بیٹھا۔ نمبردار اسی برادری کا آدمی تھا۔ سب سے پہلے مراد خان کو اپنے پاس بٹھایا اور اس سے پہلی بات یہ پوچھی کہ اپنے نوکر کے متعلق اس کی کیا رائے ہے۔ مراد خان نے بہت اچھی رائے دی۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ نوکر ادھیڑ عمر آدمی تھا۔

"پھر سوچیں" — میں نے مراد سے کہا — "آپ نے کسی وقت یا کسی موقع پر شک کیا ہوگا کہ یہ نوکر ٹھیک نہیں۔"

"نہیں ملک صاحب!" — اس نے کہا — "اسے تو آپ ایسے سمجھیں کہ پالا پوسا ہم نے ہی ہے۔ اس کی شادی بھی ہم ہی نے کرائی تھی۔ اب یہ ہمارے گھر میں ہی بوڑھا ہونا شروع ہو گیا ہے۔ یہ مجھے اس لئے بھی اچھا لگتا ہے کہ ذرا سا بھی چالاک نہیں۔ صبر اور شکر کرنے والا آدمی ہے، اور اس میں اتنی جرأت ہی نہیں کہ ہمیں دھوکہ دے یا بیلوں کو زہر دینے جیسا خطرناک جرم کرے۔"

"اور اس کی بیوی؟"

"وہ بھی اسی جیسی ہے" — مراد خان نے جواب دیا — "وہ رات کو یہاں نہیں ہوتی۔ اپنے گھر چلی جاتی ہے۔"

جوان بیوی بوڑھا خاوند

باتیں کرتے کرتے اُس نے بتایا کہ اُس کی دوسری بیوی جوان لڑکی ہے۔ اُس کی عمر پچیس چھبیس سال بتائی۔ مراد خان کی اپنی عمر ساٹھ سال سے اُوپر تھی۔ اِس لڑکی کے ساتھ اُس نے چار پانچ سال پہلے شادی کی تھی۔ مراد خان کا بڑا لڑکا جس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی، الگ مکان میں رہتا تھا۔ یہاں مجھے کچھ اور شک ہونے لگا۔ مراد خان کا اپنے بیٹے کے ساتھ جائیداد کی تقسیم کا تنازعہ ہوگا اور بیٹے نے انتقامی کارروائی کے طور پر باپ کے بیل مار دیئے ہوں گے۔

"بیٹے کے ساتھ آپ کے تعلقات کیسے ہیں؟"

"بہت اچھے!" ——— مراد خان نے جواب دیا ——— "وہ میرا دایاں بازو ہے۔ تھانے میرے ساتھ گیا تھا۔ وہ تو کہتا تھا کہ تھانے نہ جاؤ، ہم خود انتقام لیں گے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ساری زمین جائیداد اُسی کی ہے"۔

اُس نے میرا شک رفع کر دیا لیکن بوڑھے آدمی کی جوان بیوی مجھے شک میں ڈال رہی تھی۔ جوان بیوی نے اس بوڑھے کو دل سے کہاں قبول کیا ہوگا۔ ایسا ممکن تھا کہ یہ واردات اسی لڑکی نے کروائی ہو۔

یہ بھی پتہ چلا کہ مراد خان کی بیٹی، عابدہ، یہیں آئی ہوئی ہے۔ مراد خان کو باہر بھیج کر اُس کے نوکر کو بلایا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا رہا۔ میں نے اُسے بیٹھنے کو کہا تو وہ فرش پر بیٹھ گیا۔

"رات کو ذرا سا کھٹکا ہو تو تمہاری آنکھ کھُل جاتی ہے؟"

"ہاں حضور!" ——— اُس نے جواب دیا ——— "میری نیند بڑی کچی ہے ..... دروازے کے باہر کُتا بھی ہوتا ہے"۔

"رات کو تم نے کوئی آواز نہیں سُنی؟"

"سُنی تھی حضور!" ——— اُس نے جواب دیا ——— "آدمی رات کا وقت ہو گا۔ میری آنکھ کھُل گئی۔ صحن میں کوئی چل پھر رہا تھا۔ میں کلہاڑی پاس رکھتا ہوں۔

کلہاڑی اُٹھا کر صحن میں گیا تو آواز آئی کہ میں ہوں، میں ہوں، سوتے رہو ——— وہ بی بی عابدہ تھی۔ عابدہ راجہ صاحب کی بیٹی ہے۔ میکے آئی ہوئی ہے۔ میں اُس کے قریب چلا گیا تو اُس نے کہا ——— 'میں ڈنگروں کو دیکھنے آئی تھی ہوشیار ہو کے سویا کرو۔ دشمنوں کا کیا بھروسہ ہے' ——— میں نے کہا کہ دیکھ لیں۔ آپ اِدھر آئیں تو میں بغیر جگائے اُٹھ کھڑا ہُوا ..... بس جی! وہی آئی تھیں"۔

بیٹی پر تو میں شک نہیں کر سکتا تھا کہ اُس نے اپنے باپ کے بیلوں کو زہر دے دیا ہے۔ میں اِس نوکر کو اتنی جلدی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس کے مالکوں کو تو اس پر پورا بھروسہ تھا لیکن پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ یہ شخص لالچ میں آگیا ہوگا۔ میں نے اُس سے کئی اور باتیں پوچھیں جو وہ بتاتا رہا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہ جب صبح اُٹھا تو دروازہ اندر سے بند تھا۔ زنجیر چڑھی ہوئی تھی۔

"دیکھ بھائی میرے!" ——— میں نے اُسے کہا ——— "رات کو یہاں صرف تم تھے۔ دروازہ بھی اندر سے بند تھا۔ باہر کُتا بھی تھا۔ کسی کا کھُرا کھوج نہیں ملتا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ کھُرلی میں زہر کون ڈال گیا"۔

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ کس طرح گھبرایا ہوگا۔ وہ اس جُرم کا مجرم تھا یا نہیں، اُس کی گھبراہٹ قدرتی تھی۔ میں اُس پر دباؤ ڈالتا رہا اور وہ تو جیسے تڑپنے لگا۔

"تمہارے سوا یہ کام اور کوئی نہیں کر سکتا" ——— میں نے کہا ——— "بتا دو اور اپنی جان چھڑاؤ۔ یہ ان لوگوں کے اپنے جھگڑے ہیں، تم غریب آدمی کیوں پھانسی چڑھتے ہو!"

وہ تو میرے پاؤں پر گر پڑا اور قسمیں کھانے لگا پھر اُس نے ہاتھ جوڑے اور رو رو کر بتانے لگا کہ مالکوں کے اُس پر کتنے احسان ہیں اور وہ اُن کا کتنا وفادار ہے۔ غریب آدمی کی جان پر بنی ہوئی تھی اور اُس کی زبان بے قابو ہو گئی تھی۔

"آپ سے صرف ایک بات چھپا لی تھی" ——— اُس نے کہا ——— "وہ بھی

بتا دیتا ہوں لیکن ماتی باپ، انہیں یہ پتہ نہ چلے کہ میں نے آپ کو یہ بات بتا تی ہے ..... یہ تو آپ کو بتایا ہے کہ میں نے بی بی عابدہ کو صحن میں دیکھا تھا۔ وہ چلی گئی تو میں سو گیا۔ اس کے بعد پھر میری آنکھ کھل گئی۔ آواز دروازے کی زنجیر کی تھی۔ میں تو اُچھل کر اُٹھا اور دروازے کی طرف گیا لیکن ذرا پیچھے ہی رُک گیا۔ وہ تو شاداں بی بی تھی۔"

"یہ کون ہے؟"

"راجہ صاحب کی دوسری بیوی" — اُس نے جواب دیا — "اُس نے دروازہ کھولا ہوا تھا اور کسی کے ساتھ بڑی آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی۔ میں ذرا پیچھے ہٹ آیا۔"

"وہ کیا باتیں کر رہی تھی؟"

"وہ بہت آہستہ بول رہی تھی" — نوکر نے جواب دیا — "اور اُس نے زیادہ باتیں نہیں کیں ..... صرف ایک لفظ سمجھا تھا ..... نذیر ..... اُس نے یہ نام لیا تھا۔ باہر جو کھڑا تھا وہ نذیر تھا۔ بس جناب! ایک منٹ نہیں گزرا ہوگا کہ بی بی نے دروازہ بند کر کے زنجیر چڑھا دی۔ اندھیرا اتنا گہرا نہیں رہا تھا کیونکہ چاند اُبھر رہا تھا ..... اُس نے مجھے دیکھا تو ہنس پڑی اور کہنے لگی کہ میں تمہارا امتحان لے رہی تھی کہ تمہاری آنکھ کھلتی ہے یا نہیں۔ اُس نے مجھے شاباش دی پھر کہنے لگی کہ تمہارے بچوں کے کپڑے میں نے دیکھے تھے۔ تم مجھے بتاتے کیوں نہیں۔ اُن کے کپڑے پھٹے ہوتے ہیں۔ مجھ سے پیسے لے لینا اور انہیں کپڑے سلا دو۔"

نوکر نے شاداں بی بی کی کچھ اور باتیں بھی سنائیں جو اُس نے اِس نوکر کے ساتھ کی تھیں۔ ان باتوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ شاداں نوکر کی خوشامد کر رہی تھی اور وجہ یہ تھی کہ نوکر نے اُسے کسی کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ نوکر میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اُس سے پوچھتا کہ کون آیا تھا۔ یہ پوچھنا میرا کام تھا۔

"راجہ صاحب اور شاداں بی بی آپس میں خوش رہتے ہیں؟" — میں

نے پوچھا — "اور میری ایک بات غور سے سُن لو۔ کوئی بات چھپانا نہیں اور کوئی بات غلط نہ بتانا۔ میں کسی کو پتہ نہیں چلنے دوں گا۔ اگر ذرا سی بھی گڑبڑ کرو گے تو بُرے پھنسو گے ..... ہاں، بولو۔"

"ظاہری طور پر خوش رہتے ہیں" — نوکر نے جواب دیا — "لیکن میں نے یہ دیکھا ہے کہ راجہ صاحب کا وہ رُعب داب جو پہلی بیوی کی زندگی میں ہوتا تھا وہ اب نہیں رہا۔ شاداں بی بی کے آگے وہ جُھکے جُھکے رہتے ہیں اور شاداں کو ہی خوش کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔"

"ان کا بیٹا ان سے الگ کیوں ہو گیا ہے؟" — میں نے پوچھا — "باپ بیٹے کی آپس میں ناراضگی یا جھگڑا ہے؟"

"نہیں جی ..... بالکل نہیں" — اُس نے جواب دیا — "وہ تو ان کا بہت خیال رکھتا ہے اور ان کی آپس میں بہت محبت ہے۔"

"شاداں کے ساتھ بھی اُس کی محبت ہے؟" — میں نے پوچھا — "اُس کا نام کیا ہے؟"

"جمال خان" — اُس نے جواب دیا — "شاداں کے ساتھ اُس کی محبت نہیں ہو سکتی۔ ایک روز راجہ صاحب گھر نہیں تھے۔ جمال خان آ گیا۔ میں باہر صحن میں کام کر رہا تھا۔ جمال شاداں کو کمرے میں لے گیا۔ پہلے اُن کی باتیں سمجھ میں نہ آئیں پھر جمال خان زور سے بولا — خبردار! آج کے بعد میں ایسی بکواس نہ سُنوں۔ تُو نے میرے باپ کی بے عزتی کی ہے۔ اُسے لوگ جھک کر سلام کرتے ہیں اور تُو دو ٹکے کی عورت اُسے کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ شہزادی نہ بن۔ میرا باپ تیرا مالک ہے۔ میں نے پھر ایسی بات سُنی تو تیرا خون پی جاؤں گا' — جمال خان غصے میں چلا گیا اور شاداں بی بی باہر آئی تو وہ رو رہی تھی۔ میں نے مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔"

"نذیر کون ہے؟" — میں نے پوچھا — "جس کا نام تم نے رات کو شاداں سے سُنا تھا؟"

"ان کی برادری کا آدمی ہے" — اُس نے جواب دیا — "دُور پار کی

رشتہ داری ہے۔ بڑا خوبصورت جوان ہے۔"

ناجائز تعلق سے تنگ آگئی ہوں

اِس نوکر کی بیوی اِس گھر میں کام کرتی تھی۔ پوری معلومات وہ دے سکتی تھی۔ نوکر کو میں دیکھ چکا تھا۔ وہ ذرا سا بھی چالاک اور ہوشیار نہیں تھا۔ میری رائے یہ بھی کہ یہ اس جرم میں شامل نہیں ہو سکتا۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میں نے ذہن میں تفتیش کی کیا لائن بنا لی تھی۔ میرا اصل مشتبہ راجہ ولادر اور اُس کے بیٹے تھے۔ شک بھی انہی پر لکھوایا گیا تھا لیکن میرا اپنا شک کچھ اور بھی تھا۔ وہ یہ تھا کہ واردات میں اس گھر کا کوئی فرد جو نوکروں مزارعوں وغیرہ میں سے ہو سکتا تھا، شامل تھا۔

میں نوکر کی بیوی کو شاملِ تفتیش کرنا چاہتا تھا لیکن آج مجھے یاد نہیں کہ میں نے کیا سوچ کر شاداں کے ساتھ بات چیت کو بہتر سمجھا۔ بہت وقت گزر گیا ہے، بلکہ عمر گزر گئی ہے جب یہ وارداتیں ہوتی تھیں جو میں آپ کو سناتا رہتا ہوں۔ بعض تفتیشوں کے قصّے سناتے یاد نہیں رہتا کہ میں نے فلاں قدم کیوں اُٹھایا تھا۔ یہ اُس وقت کے حالات کے مطابق ہوتا تھا۔ ایسی باتیں یاد نہ رہنے سے کہانی کچھ کمزور سی لگتی ہے۔ بہرحال کہانی کی صداقت پہ آپ کو شک نہیں ہونا چاہئے۔

اس کیس میں اُس وقت کی ضرورت کے مطابق میں نے شاداں کو بلایا تو راجہ مراد خان آگیا۔ اُس نے پوچھا کہ میں نے اُس کی بیوی کو کیوں بلایا ہے، زہر تو ہمارے دشمنوں نے دیا ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ میرے کام میں دخل نہ دے، میں تو ابھی معلوم نہیں کس کس کو تھانے بلاؤں گا۔ وہ اس میں اپنی بے عزتی سمجھ رہا تھا کہ میں اُس کی بیوی کو بلا رہا ہوں۔ اُس نے منت سماجت شروع کر دی۔ اتنے میں اُس کا بیٹا جمال آگیا۔ اُس نے بھی کہا کہ میں شاداں کو تفتیش میں شامل نہ کروں۔

"پھر میں تھانے چلا جاتا ہوں" — میں نے کہا — "اور تمہاری عورتوں کو وہاں بلاؤں گا .... تم لوگ عزت کا نام لے کر اپنی کرتوت پر پردہ ڈالنا چاہتے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ لوگ تمہارا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ ہندو اور سکھ تم پر ہنس رہے ہیں۔"

"جناب!" — مراد نے کہا — "ہمارے تین بیل مارے گئے ہیں اور آپ ...."

"اور تم نے اُن کا ایک بیل اور دُودھ دینے والی بھینس مار دی تھی" — میں نے کہا — "لیکن میں نے تم لوگوں کو سزا سے بچا لیا تھا۔ اب میں تمہاری دشمنیاں ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں گا۔ میرے آگے رکاوٹ بنو گے تو تمہاری عزت اس مٹی میں ملا دوں گا۔ جاؤ، اپنی بیوی کو میرے پاس بھیجو اور یہاں سے دُور ہٹ جاؤ۔"

شاداں آگئی۔ وہ مراد خان کے بیٹے جمال خان سے بھی چھوٹی تھی۔ وہ مراد خان کی سب سے چھوٹی بہن لگتی تھی۔ بڑی خوبصورت لڑکی تھی۔ اُس کے چہرے پر جوانی اور تندرستی کی لالی تھی لیکن ایسے لگتا تھا جیسے یہ لڑکی انگارے کی طرح دہک رہی ہو۔ اُس کی آنکھوں میں بھی ایسا ہی تاثر تھا۔ اُس کے اَدھ کھلے ہونٹوں کا تاثر تو کچھ اور ہی تھا۔ اُس کا چہرہ اور انداز بتا رہا تھا کہ یہ لڑکی معصوم نہیں۔

"شاداں!" — میں نے اُسے کہا — "مجھ سے ڈرنا نہیں، ذرا سا بھی نہ گھبرانا۔ مجھے اپنا ہمدرد سمجھنا۔ تمہیں دیکھ کر میرے دل میں تمہاری ہمدردی پیدا ہو گئی ہے۔ اگر تم اپنے بوڑھے خاوند کو زہر پلا دو تو بھی میں تمہیں نہیں پکڑوں گا۔ میں کہوں گا کہ شاداں، تو نے جو کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔"

اُس کی نظریں میرے چہرے پر جم گئیں پھر اُس کی نظریں میری آنکھوں میں آگئیں۔ میں اس منظر کو اچھی طرح بیان نہیں کر سکتا اور بیان کرنا بھی نہیں چاہتا۔ اُس وقت میرے چہرے پر بھی ایسی ہی سفیدی اور ایسی ہی لالی ہُوا کرتی تھی اور میری آنکھوں میں اس لڑکی جیسی چمک تھی۔ البتہ اُس کی ادھ

میری نظروں میں فرق تھا۔ اُس نے جن نظروں سے میری آنکھوں میں دیکھا اُن میں اُس کے جذبات بھرے ہوتے تھے جو اپنی تسکین چاہتے تھے۔

میں پلنگ پر بیٹھا ہُوا تھا۔ پاؤں فرش پر تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ کرسی میرے قریب کرلے۔ وہ تو جیسے اسی انتظار میں تھی۔ اُس نے ٹھک سے کرسی پلنگ کے ساتھ لگا دی اور ایک ہاتھ میرے بازو پر رکھ دیا۔ میں اُسے اپنے قبضے میں لینا چاہتا تھا۔ وہ قبضے میں آگئی۔

"تمہارے دل میں میرا ڈر تو نہیں رہا؟" ——میں نے پوچھا۔

"لو، ڈر کیسا!" ——اُس نے نشے سے لہجے میں کہا —— "تم جیسے خوبصورت جوان سے میں کیوں ڈروں؟"

اُس کے جذبات آوارہ ہو چکے تھے اور اس کا ذمہ دار اس کا باپ اور مراد خان تھے۔ اگر وہ گناہ کی طرف مائل ہو رہی تھی تو اصل گناہگار یہ دونوں اشخاص تھے۔ میں اِس لڑکی کو اِس کیفیت میں دیکھ کر خوش ہُوا کہ یہ راز اُگل دے گی۔ اُس کے ساتھ میری دلچسپی بس یہی تھی۔

"پہلے ایک دو کام کی باتیں ہو جائیں" ——میں نے کہا —— "نذیر کو تم گھر بلایا کرتی ہو؟ .... اس طرح پکڑی جاؤ گی۔ احتیاط کیا کرو"

اُس کا ہاتھ میرے بازو سے ہٹ گیا۔ وہ جو میری طرف ذرا جُھکی ہُوئی تھی، پیچھے ہٹ گئی اور اُس کی آنکھوں کا نشہ اُتر گیا۔

"آپ کو کس نے بتایا ہے؟" ——اُس نے آہستہ سے پوچھا۔ پہلے وہ تم کہتی رہی تھی، اب اُس نے آپ کہا۔

"میں جو پوچھتا ہوں وہ بتاؤ" —— میں نے پیار کے لہجے میں کہا —— "اس کے بعد دوسری باتیں کریں گے... اور شاداں! میں تمہیں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ میرے آگے جھوٹ نہ بولنا۔ بُری پھنسو گی۔ میرے سوال کا جواب دو۔ نذیر کے ساتھ تمہاری دوستی ہے نا!"

اُس نے اقرار میں سر ہلایا۔

"گھبراؤ نہیں" ——میں نے کہا —— "مجھے تمہاری اِس دوستی پر کوئی اعتراض

نہیں۔ میں کچھ اور معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ تم نے اپنے بوڑھے خاوند سے انتقام لیا ہے کہ اُس نے اس بڑھاپے میں تمہارے ساتھ شادی کرلی ہے .... نذیر بیلوں کو زہر دینے آیا تھا نا!"

"نہیں!" ——اُس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے بازو پر رکھ کر سسکتے کے لہجے میں کہا —— "میرے سر پر قرآن رکھو۔ مجھے مسجد میں لے چلو۔ میں نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں۔ یہ میرا اپنا گھر ہے" —— وہ چُپ ہو گئی اور پہلے سے مختلف لہجے میں کہنے لگی —— "اگر میں نے زہر دینا ہوتا تو اِن بے زبان جانوروں کو کیوں دیتی، اپنے باپ اور اس بوڑھے خاوند کو دیتی" —— اس کے ساتھ ہی اُس کے آنسو نکل آئے۔

"نذیر کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"آپ اتنے بچے ہیں کہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکتے!" —— اُس نے بڑی پکّی آواز میں کہا —— "شادی سے پہلے ہم ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ ہماری شادی ہو سکتی تھی لیکن اُس کی کہیں اور ہو گئی اور مجھے بوڑھے مراد کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ سچی بات ہے تھانیدار جی! میں نے نذیر سے کہا کہ میرے خاوند تم ہو"

اُس نے نذیر کے ساتھ تعلقات کی کچھ باتیں سنائیں اور یہ بھی بتایا کہ وہ کہاں کہاں اور کس طرح ملتے رہے ہیں۔ یہ غلطی شاداں نے پہلی بار کی کہ نذیر کو اپنے گھر بُلا لیا۔ اُسے بلایا کسی اور طرف سے تھا اور نکالا اِس طرف سے۔ مراد خان کے جاگ اُٹھنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا کیوں شاداں نے اُسے دُودھ میں افیم پلا دی تھی۔ نذیر کو پچھلے دروازے سے نکالنے کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ سامنے والے دروازے کے سامنے تین چار آدمیوں کی باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

شاداں کے ساتھ میں نے بہت سارا وقت صَرف کیا تھا۔ اُس کے ساتھ اتنی ہی باتیں نہیں ہوئی تھیں جتنی آپ کو سناتی ہیں۔ میں پوچھ گچھ کرتے گہرائی میں اور باریکیوں میں چلا گیا تھا۔ میں نے تسلیم کر لیا کہ شاداں اور نذیر کا اِس

واردات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ شاداں نے یہ بھی بتا دیا کہ نوکرانی اُس کے راز سے واقف ہے۔

"اب تم جاؤ" ــــ میں نے اُسے کہا ــــ "یہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کرنا کہ مجھے تمہارے اور نذیر کے تعلق کا کس نے بتایا ہے"۔

"اُسی بدبخت نے بتایا ہوگا جو مویشیوں کی رکھوالی کے لئے وہاں سوتا ہے" ــــ اُس نے کہا ــــ "ان کمینوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہیئے"۔

"نہیں شاداں!" ــــ میں نے کہا ــــ "اُس کی تو ڈر کے مارے بات ہی نہیں نکلتی تھی۔ گاؤں کے دو آدمی اور ہیں جنہوں نے نذیر کو تمہارے گھر سے نکلتے دیکھا تھا۔ ذرا اور احتیاط کیا کرو"۔

وہ پلنگ پر میرے پاس بیٹھ گئی اور ایک بازو میرے گلے میں ڈال کر میرے ساتھ چپک گئی۔

"تم احتیاط کی بات کرتے ہو" ــــ وہ پھر مجھے کہنے لگی ــــ "میں نذیر پر بھی تھوک دوں گی۔ خدا کی قسم، تم نے تو میرے دل کو چیر دیا ہے۔ تم تھانیدار ہو۔ تمہیں کوئی نہیں پکڑ سکتا"۔

"میں ایسا کام نہیں کروں گا" ــــ میں نے کہا ــــ "ابھی اپنا کام کر رہا ہوں ...."

"نہیں نہیں" ــــ اُس نے بڑی بے تکلفی سے مجھے ہلکا سا دھکا دے کر کہا ــــ "میں ناجائز تعلق کی نہیں کہہ رہی۔ مجھے اپنے اللہ کی قسم ہے، میں ناجائز تعلق سے تنگ آگئی ہوں۔ میں تو بڑی عزت اور آبرو والی تھی۔ قسمت ایسی پھوٹی کہ جھک مار رہی ہوں" ــــ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کہنے لگی ــــ "میں جائز بات کر رہی ہوں۔ تم تھانیدار ہو۔ میرے خاوند کو ڈراؤ اور مجھے طلاق دلوا دو پھر میں تمہارے پاس آجاؤں گی۔ اگر میں تمہیں اتنی اچھی نہیں لگی جتنا تم مجھے اچھے لگے ہو تو صاف کہہ دو"۔

"پہلے یہ تفتیش تو ختم کر لوں" ــــ میں نے کہا ــــ "پھر کچھ کروں گا"۔

"وعدہ؟"

"پکا وعدہ!" ــــ میں نے کہا

"میں بالکل تیار رہوں گی" ــــ اُس نے کہا۔

بڑی مشکل سے اُسے باہر نکالا۔ میری شادی کو دو سال سے دو چار مہینے اُوپر ہو گئے تھے اور میں پہلی بار بیوی کو اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس گاؤں سے جب میں اپنے گھر گیا تو بیوی کو بتایا کہ ایک لڑکی کے ساتھ آج کیا بات چیت ہوئی ہے۔

"لے آؤ اُسے" ــــ میری بیوی نے کہا ــــ "پھر کوئی اور تھانیدار آکر ایک تھانیدار اور ایک لڑکی کے قتل کی تفتیش کرے گا"۔

شاداں کی ماں کی استادی

میں نے تفتیش کو آگے بڑھانے کے لئے گاؤں میں ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ دوسرے گاؤں کے آدمی کچھ دیر سے آتے بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں کچھ وقت اور انتظار میں بٹھاتے رکھا اور گاؤں کے معززین کو باری باری بلا کر اُن سے پوچھنے لگا۔ ان میں سے دو نے مراد خان کے خلاف یہ بات کی کہ اُس نے ایک جوان لڑکی کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ ان دونوں کو معلوم تھا کہ شاداں اور نذیر کا میل جول ہے۔ انہوں نے اس خطرے کا اظہار کیا کہ ایک نہ ایک دن نذیر جمال کے ہاتھوں قتل ہو جائے گا اور ہو سکتا ہے مراد خان ہی قتل ہو جائے۔

ان سب نے یہ بات متفقہ طور پر کہی کہ بیلوں کو زہر دلاور نے دلوایا ہے۔ اُنہوں نے مجھے ایک ایسی بات بتائی جو معلوم نہیں مراد خان نے، شاداں نے اور نوکرانی نے کیوں نہیں بتائی تھی۔ یہ تو مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ مراد خان کی بیٹی عابدہ جو دلاور کی بہو تھی میکے آئی ہوئی تھی لیکن مجھے اب پتہ چلا کہ مراد خان کا داماد یعنی دلاور کا بیٹا عزیز بھی یہاں آیا ہوا تھا اور وہ ایک رات اور ایک دن یہاں رہ کر کل شام کو گیا ہے۔

ان معززین سے مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ شاداں اور عابدہ کی آپس میں لڑائی

رہتی تھی۔ شاداں مراد خان پر غالب آئی ہوئی تھی۔ شاداں کی ماں کے متعلق بتایا گیا کہ بہت چالاک اور بدعورت ہے۔ عابدہ کے لئے ایک رشتہ گاؤں میں موجود تھا لیکن شاداں اور اُس کی ماں عابدہ کو گھر سے نکالنا چاہتی تھیں۔ اُنہوں نے سوچا کہ گاؤں میں ہی اس کی شادی ہوگئی تو یہ اپنے باپ پر سوار رہے گی۔ چنانچہ شاداں کی ماں نے ایسی اُستادی کھیلی کہ دلاور کی بیوی کے ساتھ جادو ستی گانٹھی اور اُسے تیار کر لیا کہ وہ اپنے بیٹے عزیز کے لئے عابدہ کو مانگ لے۔

مختصر یہ کہ عزیز کی ماں نے اپنے خاوند کو راضی کر لیا اور وہ دونوں رشتہ مانگنے آتے۔ اِدھر شاداں اور اُس کی ماں نے عابدہ کے باپ پر جادو چلا رکھا تھا۔ اُس نے عابدہ کا رشتہ دے دیا۔ عزیز کی ماں نے عابدہ کا رشتہ انتقام کے لئے لیا تھا۔ وہ عابدہ کو بہو بنا کر تنگ کرنا چاہتی تھی۔ میرے لئے یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ برادریوں میں آج بھی ایسی مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں کہ کسی لڑکی کا رشتہ لیا گیا اور ساس نے بہو کے خلاف اپنے بیٹے کے کان بھرنے شروع کر دیئے اور ایک سال کے اندر اندر بہو کو طلاق دلا دی۔

یہ انتقام کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔

رات ہوگئی تھی۔ سلوتری (ویٹنری ڈاکٹر) کی رپورٹ آگئی۔ اُس نے لکھا کہ معدے میں غیر ہضم شدہ سرسوں کے پتے پائے گئے ہیں اور موت زہر سے واقع ہوئی ہے۔ اُس نے موت کا وقت سحری کا لکھا تھا۔ ڈاکٹر نے معدے کے اجزا ماہرین کے معائنے اور رپورٹ کے لئے دستی لاہور بھیج دیئے تھے۔ اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ زہر سرسوں کے پتوں میں دیا گیا تھا۔

میرے لئے یہ خبر بڑے کام کی تھی کہ مراد خان کا داماد عزیز یہاں آیا تھا اور مراد خان کے گھر ٹھہرا تھا۔ میرے ذہن میں یہ شک آیا کہ اُس نے دن کے وقت بیلوں کو ایسا زہر دیا جو آہستہ آہستہ اثر کرتا رہا اور بیل سحری کے وقت مرے۔ میں نے اس شک کی بنا پر مراد خان کے نوکر کو پھر بلایا۔

"یاد کرنے کی کوشش کرو" ——— میں نے اُسے کہا ——— "عابدہ کا خاوند عزیز یہاں آیا تھا۔ کیا وہ جانے سے پہلے اُس طرف گیا تھا جہاں مویشی بندھے ہوتے تھے؟"

"گیا تھا جی!" ——— نوکر نے جواب دیا ——— "عابدہ اُس کے ساتھ تھی۔ اُس نے گھوڑی کے ارد گرد پھر کر دیکھا تھا پھر وہ بیلوں والی کھُرلی پر آیا تھا اور اُس نے وہ بیل بڑے غور سے دیکھا تھا جس کو میلے میں انعام ملا تھا۔ اس کی وہ تعریف کرتا تھا۔"

"وہ جتنی دیر وہاں رہا تم بھی وہیں رہے تھے؟" ——— میں نے پوچھا۔

"نہیں جی!" ——— اُس نے جواب دیا ——— "بی بی عابدہ نے مجھے کہا تھا کہ جاؤ اپنا کام کرو۔"

"تم جب واپس وہاں گئے اور مویشیوں کو چارہ ڈالا تو کھُرلی میں تم نے سرسوں کے پتے دیکھے تھے؟"

"نہیں جی!" ——— اُس نے جواب دیا ——— "مجھے اچھی طرح یاد ہے، کھُرلی میں سرسوں کے پتے نہیں تھے۔"

"یاد کرو اور بتاؤ" ——— میں نے پوچھا ——— "عزیز جتنا وقت یہاں رہا، کیا وہ گھر میں رہا تھا یا باہر نکل گیا تھا؟"

میں نے یہ سوال کسی اور خیال سے کیا تھا۔ اس کے بعد مجھے نوکر کے جواب کے مطابق مزید سوال کرنے تھے لیکن نوکر نے ایسا جواب دیا جیسے اندھیرے میں اُس نے مجھے روشنی دکھا دی ہو۔

"وہ باہر بھی گیا تھا" ——— نوکر نے کہا ——— "گاؤں سے تھوڑا ہی دُور ایک سنیاسی کا ڈیرہ ہے۔ لوگ اُس کے پاس علاج کے لیے جاتے ہیں۔ وہ بڑا سیانا ہے جی! راجہ صاحب کے کھیت اُدھر بھی ہیں۔ میں وہاں کام سے گیا تھا۔ عزیز کو میں نے سنیاسی کے ڈیرے سے نکلتے دیکھا تھا۔"

سنیاسی کا ڈیرہ

اتنے میں باہر شور اُٹھا۔ ایک آواز میرے ہیڈ کانسٹیبل کی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا —— "میں بغیر بلاتے اندر نہیں جانے دوں گا۔"

"اوئے تم نے ہمیں کس جرم میں بٹھایا ہوا ہے" — کوئی کہہ رہا تھا۔

"دیکھو یارو!" — یہ کسی اور کی آواز تھی —— "صبح سے بلایا ہوا ہے اور آدھی رات ہو گئی ہے۔"

"تھانیدار ہے، ہمارا خدا تو نہیں" — کسی اور نے کہا۔

پھر سب اکٹھے بولنے لگے۔ میں باہر نکلا۔ باہر دو لالٹینیں جل رہی تھیں۔ ان کی روشنی میں مجھے چھ سات آدمی اکٹھے کھڑے نظر آتے۔ میں راجہ دلاور خان کو پہچانتا تھا۔ وہ بھی ان میں تھا۔ یہ دوسرے گاؤں کے آدمی تھے جنہیں میں نے شک میں بلایا تھا۔ ان کا واویلا بجا تھا میں نے انہیں صبح سے بلایا ہوا تھا اور ان کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ میں سب کو اندر لے گیا اور مراد خان کے نوکر کو بھیج دیا۔ دلاور خان بولنے لگا تو میں نے اسے روک دیا۔

"مجھے ملزم دے دو اور جاؤ" —— میں نے کہا —— "کسی سے ایک لفظ نہیں پوچھوں گا۔"

"ملک صاحب!" —— دلاور بولا —— "آپ کو یہ شک ہے کہ بیلوں کو ہم نے زہر دیا ہے کیونکہ انہوں نے ہمارے ایک بیل اور ایک بھینس کو زہر دیا تھا جناب! پورا ایک سال گزر گیا ہے۔ اگر ہم نے بدلہ لینا ہوتا تو ایک سال انتظار نہ کرتے۔ ہم نے تو دشمنی عداوت ختم کر دی تھی۔ اس کا ثبوت دیکھ لیں۔ راجہ مراد خان کی بیٹی میری بہو ہے۔ آپ بلاوجہ ہم پر زیادتی کر رہے ہیں۔ اگر راجہ مراد نے ہم پر شک کیا ہے تو اس شخص پر لعنت ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کا دل صاف نہیں ہے۔"

"آپ کا بیٹا عزیز کون سا ہے؟" —— میں نے پوچھا۔

"میں ہوں" —— عزیز نے کہا۔

"آپ سب باہر بیٹھیں" —— میں نے کہا —— "میں نے آپ کو بلاوجہ نہیں بٹھایا ہوا۔ میں نے سارا دن جو تفتیش کی ہے وہ آپ کے فائدے کے لئے کی ہے۔ آپ کی طرف تو میں نے ابھی توجہ ہی نہیں دی۔ میں اپنے ایک شک پر کام کر رہا ہوں۔ آپ صبر کر کے بیٹھے رہیں۔"

"میرے بیٹے سے آپ کیا پوچھیں گے؟" —— دلاور خان نے پوچھا۔

"راجہ دلاور خان!" —— میں نے کہا —— "میں نے آپ لوگوں کے ساتھ شرافت سے بات کی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ میرے سر پر سوار ہو جائیں۔ دوبارہ مجھ سے یہ پوچھنے کی جرأت نہ کرنا کہ میں اس سے کیا پوچھوں گا اور اُس سے کیا پوچھوں گا۔ چلو باہر اور آرام سے بیٹھ جاؤ۔"

وہ چلے گئے تو عزیز کو میں نے کرسی پر بٹھا لیا۔

"عزیز دوست!" —— میں نے کہا —— "میں کوئی فالتو بات نہیں کروں گا نہ پوچھوں گا۔ تمہیں یاد ہے کہ تمہارے بیل اور بھینس کو ان لوگوں نے زہر دیا تھا تو میں نے انہیں نہیں پکڑا تھا۔ اب تم نے ان کے تین بیلوں کو زہر دے دیا ہے تو تمہیں بھی نہیں پکڑوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ اپنی زبان سے کہہ دو کہ تم نے یہ کام کیا ہے۔"

"میں آپ کو وہی جواب دوں گا جو میرا ابا آپ کو دے چکا ہے" —— اُس نے کہا —— "ہم اگر بدلہ لینا چاہتے تو ایک سال انتظار نہ کرتے۔"

"اپنے ابا کی بات چھوڑ یار!" —— میں نے کہا —— "اپنی بات کرو۔"

میری اس بات کے جواب میں وہ انکار ہی کرتا رہا۔

"مجھے صرف یہ بتا دو کہ سنیاسی کے پاس تم کیا لینے گئے تھے؟" —— میں نے پوچھا۔

سنیاسیوں کے متعلق پہلے کسی کہانی میں آپ کو بتایا تھا کہ یہ لوگ جنگلوں سے جڑی بوٹیاں اکٹھی کر کے ان کی دوائیاں بنایا کرتے تھے اور عموماً آبادیوں سے ذرا ہٹ کر ڈیرے ڈال لیتے تھے۔ بعض شہروں میں بھی رہتے تھے۔ ان

کا حال حلیہ اور لباس سادھوؤں اور ملنگوں جیسا ہوتا تھا۔ ان کے پاس سانپوں اور بچھوؤں کا زہر بھی ہوتا تھا۔ سنکھیا جو بڑا تیز زہر ہے، ان سے ملتا تھا۔ زہر اپنے پاس رکھنا اور بیچنا جرم تھا لیکن یہ لوگ قانون کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور منہ مانگے داموں چوری چھپے زہر دے دیتے تھے۔

مراد خان کے نوکر نے عزیز کو سنیاسی کے ڈیرے سے نکلتے دیکھا تھا۔ وہ ضرور وہاں سے زہر لایا تھا اور اس نے یہ زہر خود بیلوں کو کھلایا یا کسی کے ہاتھ سے دلوایا ہوگا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ سنیاسی کے ڈیرے میں کیوں گیا تھا۔

"میں اپنے لئے دوائی لینے گیا تھا" — اس نے کہا — "کسی نے بتایا تھا کہ یہ سنیاسی بہت سیانا ہے اور اس کے ہاتھ میں شفا ہے۔"

"اس کے ہاتھ میں اور بھی بہت کچھ ہے" — میں نے کہا — "سنکھیا بھی اور جیسا زہر چاہو اس کے پاس ہے، لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں تکلیف کیا ہے؟"

"چار سال پرانا نزلہ ہے" — اس نے جواب دیا — "ذرا ٹھنڈی ہوا چلتی ہے تو مجھے چھینکیں آنے لگتی ہیں۔"

"اس نے دوائی دی تھی؟"

"کیوں نہیں دی تھی؟" — اس نے کہا — "اس نے آٹھ پڑیاں دی ہیں، صرف ایک پڑیا ہر روز کھانی ہے۔"

"پڑیاں گھر میں ہیں؟"

"ہاں جی!" — اس نے جواب دیا — "میں آپ کو دکھا سکتا ہوں۔"

"وہ تو میں ضرور دیکھوں گا" — میں نے کہا — "تم یہ سوچ لو کہ میں سنیاسی سے بھی پوچھوں گا۔"

میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا۔

"اس کے گاؤں جاؤ" — میں نے کہا — "میری گھوڑی لے جاؤ۔ یہ تمہیں بتاتا ہے کہ اس نے کل سنیاسی سے آٹھ پڑیاں لی تھیں، وہ کہاں

رکھی ہیں۔ اس کے گھر جا کر وہ پڑیاں لے آؤ۔"

عزیز اس کے ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا۔ اس نے ہیڈ کانسٹیبل کو بتایا کہ پڑیاں کہاں رکھی ہیں اور کہا کہ اس کی ماں کو وہ جگہ بتا کر پڑیاں اٹھا لانا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کتنا کچھ سچ بول رہا ہے۔ میں نے اسے باہر بھیج دیا اور خود ذرا آرام کے لئے لیٹ گیا۔

کیا یہ ممکن تھا؟

یہ قتل کا کیس نہیں تھا کہ میں وہیں بیٹھا رہتا لیکن میں اس تفتیش کو لٹکانا نہیں چاہتا تھا۔ اپنا جنون بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میں نے کچھ دیر آرام کر لیا در ہیڈ کانسٹیبل واپس آگیا۔ عزیز کا گاؤں میل سوا میل دور تھا۔ اس نے مجھے چھ پڑیاں دیں جو وہ عزیز کے گھر سے لایا تھا۔ میں نے عزیز کو اندر بلایا۔

اس کے آنے تک میں نے ایک پڑیا کھول لی۔ یہ اسی قسم کے اخبار کا کاغذ تھا جیسا کاغذ مجھے بیلوں کی کھرلی کے قریب سے ملا تھا۔ وہ کاغذ ذرا بڑا تھا۔ اخبار وہی لگتا تھا۔ یہ اردو کا اخبار تھا۔ اس کے ہر ٹکڑے پر اخبار کا نام تو نہیں لکھا تھا لیکن چھپائی اور الفاظ کی شکل اور سائز سے پتہ چلتا تھا کہ یہ اسی اخبار کے ٹکڑے ہیں۔ ہر پڑیا ایسے ہی کاغذ کی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ زہر کی پڑیا بھی اسی سنیاسی سے آئی ہے اور لانے والا عزیز کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

"عزیز!" — میں نے اسے کہا — "تم مان کیوں نہیں جاتے؟ اب بھی وقت ہے۔"

"جناب! میں کیا مانوں؟" — اس نے کہا — "آپ خواہ مخواہ مجھ پر الزام تھوپ رہے ہیں۔"

"میں کہہ رہا ہوں اب بھی وقت ہے" — میں نے کہا — "میں جب شہادت اکٹھی کر لوں گا تو پھر تمہاری ایک نہیں سنوں گا۔ تم سنیاسی سے

زہر لاتے ہو؟"

"میں اُس سے سوائے اِس دوائی کے کچھ نہیں لایا"—— اُس نے بڑی پکّی آواز میں کہا۔

میں نے اُسی وقت ضروری کارروائی کا ارادہ کر لیا۔ سنیاسی کا ڈیرہ کہیں قریب ہی تھا۔ ایسا ہو سکتا تھا کہ اُسے اطلاع مل جاتی کہ پولیس کو پتہ چل گیا ہے کہ زہر اُس سے لیا گیا تھا۔ اس اطلاع پر وہ رات ہی رات وہاں سے غائب ہو سکتا تھا۔

میں نے عزیز کو ساتھ لیا، ہیڈ کانسٹیبل اور تین کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر سنیاسی کے ڈیرے کی طرف چل پڑا۔ نمبردار اور ایک سفید پوش بھی میرے ساتھ گئے۔ ہیڈ کانسٹیبل کے پاس ٹارچ تھی۔

سنیاسی کا ڈیرہ چھوٹا سا ایک خیمہ تھا۔ دونوں طرف سے خیمے کے پردے گرے ہوئے تھے۔ میں نے ایک طرف کے پردے اُٹھا دیئے اور ٹارچ جلا کر اندر دیکھا۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ سنیاسی گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ اُس کے قریب ایک اور آدمی سو رہا تھا۔ پہلے اُس کی آنکھ کھلی۔ اُس نے پوچھا کون ہے۔

"اسے جگاؤ"—— میں نے کہا —— "اسے بتاؤ پولیس آئی ہے"۔

وہ میری آواز پر جاگ اُٹھا۔ اُس کے سر کے بال عورتوں کی طرح لمبے تھے اور داڑھی بھی لمبی تھی۔ اُس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔

میں نے ٹارچ ہیڈ کانسٹیبل کو دے دی اور لالٹین لے لی۔ سب سے کہا کہ وہ باہر چلے جائیں۔ سنیاسی کو میں نے بٹھا لیا اور اُس کے سامنے بیٹھ کر لالٹین ایک طرف رکھ دی۔ اُس نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ اُس کے سامنے تھانیدار بیٹھا ہے۔

"بغیر ہیرا پھیری کے مجھے بتا دو کہ کل، پرسوں یا ایک دو دن پہلے تم سے زہر کون لے گیا تھا"—— میں نے کہا —— "فوراً بولو"۔

"نہیں حضور!"—— اُس نے کہا اور اس سے آگے وہ جو کچھ کہنے لگا تھا وہ میں نے نہ کہنے دیا۔

"زہر تمہارے کاغذ میں گیا ہے"—— میں نے کہا —— "اور زہر لے جانے والا مان گیا ہے۔ تمہارے جھوٹ کی کوئی گنجائش نہیں۔ نہیں بتاؤ گے تو تمہارا یہ سارا سامان تھانے پہنچ جائے گا"۔

آخر وہ مان گیا۔ یہ تو وہ نہیں بھول سکتا تھا کہ زہر کون لے گیا ہے۔ زہر کا گاہک تو کبھی کبھار آتا ہوگا۔ سنیاسی نے مجھے رشوت پیش کی اور یہ بھی کہا کہ میں اُسے گرفتار نہ کروں اور وہ مجھے ایسی دوائی دے گا جو مجھے ایک سو سال تک جوان رکھے گی۔

"وہ اسی گاؤں کی لڑکی ہے"—— سنیاسی نے کہا —— "کہتی تھی دو کتّوں کو مارنا ہے۔ میں نے اس کے مطابق اُسے ایک چیز دی۔ وہ کہنے لگی کہ تھوڑا ہے"۔

"اس لڑکی کا نام جانتے ہو؟"

"نام تو میں ضرور پوچھا کرتا ہوں حضور!"—— اُس نے کہا —— "اُس کا نام عابدہ ہے۔ باپ کا نام راجہ مراد خان بتاتی تھی۔ میں نے پندرہ روپے مانگے تو اُس نے پندرہ روپے دے دیئے"۔

پندرہ روپے معمولی رقم نہیں تھی۔ اسے آج کے تین یا ساڑھے تین سو روپے سمجھ لیں۔

میں نے عزیز کو بُلا کر اُس کے سامنے کیا تو اُس نے کہا کہ یہ نزلے کی دوائی لے گیا تھا، اس نے زہر نہیں لیا تھا۔ میں نے نمبردار اور ایک اور آدمی کی موجودگی میں سنیاسی سے سنکھیا برآمد کرایا جس کی مقدار بہت تھوڑی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں عابدہ کا نام سُن کر ذرا ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ یہ مجھے کوئی ڈرامہ نظر آنے لگا —— کیا یہ ممکن تھا کہ بیٹی نے اپنے باپ کے بیلوں کو زہر دے دیا ہو؟ —— میں نے ابھی عابدہ کو دیکھا ہی نہیں تھا۔

میں نے سنیاسی کو اپنے ساتھ لے لیا اور سب کو ساتھ لے کر میں گاؤں میں چلا گیا۔ عابدہ کو بلایا اور میں نمبردار کے گھر کے اُسی کمرے میں بیٹھ گیا۔

زہر ساس کو دینا تھا

عابدہ خوبصورت لڑکی تھی۔ وہ جاگ کر آئی تھی۔

"عابدہ!" — میں نے اُسے کہا — "آؤ سیدھی سیدھی باتیں کریں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ سنیاسی سے تم زہر کیوں لائی تھیں؟"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ میں اُسے دیکھتا رہا۔

"بولو عابدہ!" — میں نے کچھ دیر بعد کہا — "اُس سنیاسی کو میں ساتھ لے آیا ہوں جس سے تم زہر لائی تھیں۔ کیوں لائی تھیں؟"

"اپنی ساس کو دینا تھا" — اُس نے کہا۔

"ساس نے زہر کو کیا کرنا تھا؟"

"میں نے ساس کو زہر دے کر مارنا تھا" — اُس نے جواب دیا — "مجھے بہت تنگ کرتی ہے۔ اپنے بیٹے کو کہتی ہے کہ اسے طلاق دے دو۔"

"اب واپس سسرال جاؤ گی تو اُسے زہر دو گی؟"

"نہیں" — اُس نے کہا — "میں ڈر گئی ہوں۔ زہر پھینک دیا ہے۔"

"کہاں؟"

"کھیت میں!" — اُس نے جواب دیا۔

"کب؟"

"پرسوں!" — اُس نے جواب دیا۔

"بیوقوف لڑکی!" — میں نے کہا — "وہاں سے پڑیا اُٹھا کے کوئی مُنہ میں ڈال لے یا چکھ لے کہ یہ کیا ہے تو وہ مر جائے گا۔ ابھی میرے ساتھ چلو اور مجھے وہ جگہ دکھاؤ۔ میں پڑیا اُٹھا کر آگ میں پھینک دوں گا۔"

اُس کے چہرے پر گھبراہٹ آگئی اور وہ چُپ رہی۔

"میں نے کیا کہا ہے عابدہ!" — میں نے کہا — "میرے ساتھ چلو۔"

"پُڑیا وہاں نہیں ہوگی" — اُس نے کہا۔

"پھر کہاں ہوگی؟"

"میں نے کہیں اور پھینکی تھی" — اُس نے کہا۔

"چلو، وہاں لے چلو" — میں نے کہا — "اور اب یہ بتاؤ کہ تم نے پہلے جھوٹ کیوں بولا ہے؟"

یہ کوئی راز تھا۔ میں اس لڑکی کے پیچھے پڑ گیا۔ مجھے کچھ شک ہونے لگا جیسے یہ لڑکی نارمل نہیں۔ میں سوال کچھ اور کرتا اور وہ جواب کچھ اور دیتی تھی اُس نے مجھے پریشان کر دیا۔

"میں تمہیں بتاتا ہوں وہ زہر کہاں ہے" — میں نے ایسے لہجے میں کہا جس میں غصے کی جھلک بھی تھی — "تم نے وہ زہر اپنے خاوند کو دے دیا تھا اور تمہارے خاوند نے وہ زہر تمہارے بیلوں کے چارے میں ڈال دیا تھا۔ تمہارا خاوند میرے پاس ہے۔ میں اُسے گرفتار کر کے تھانے لے جا رہا ہوں۔ اسے تو میں پھانسی دلواؤں گا۔"

"نہیں!" — وہ تڑپ اُٹھی — "اُس کا کوئی قصور نہیں۔"

اُس وقت تک ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ میں نے اُس پر اتنے سوال کئے تھے کہ وہ بے حال ہو گئی تھی۔ وہ جھوٹ پہ جھوٹ بول رہی تھی۔ اُسے یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ میں فلاں سوال اُس سے دو مرتبہ پہلے بھی پوچھ چکا ہوں اور اُس نے دو مختلف جواب دیئے تھے۔

"عابدہ!" — میں نے اُس کی طرف جُھک کر رازداری سے کہا — "مجھ سے کیا چھپانے کی کوشش کر رہی ہو؟ کچھ نہیں چھپا سکو گی۔ اب بتا دو گی تو بچ جاؤ گی۔ تم نے اپنے بیلوں کو زہر نہیں دیا، تمہارے خاوند نے دیا ہے۔"

وہ جرائم پیشہ لڑکی تو نہیں تھی کہ ہیرا پھیری کو قائم رکھتی۔ اُس کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ نیند کا اثر بھی تھا۔ تنگ آ کر وہ پھٹ پڑی۔

"میرے خاوند کو ہاتھ نہ لگانا" — اُس نے کہا اور اونچی آواز میں بولی — "بیلوں کو زہر میں نے دیا ہے۔"

"تم نے؟" — میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں، میں نے" — اُس نے کہا — "میرے خاوند کو تو معلوم ہی نہیں۔ اپنے باپ کے بیلوں کو میں نے مارا ہے۔ مجھے گرفتار کر لو۔ مجھے پھانسی دلواؤ۔"

میری تو جیسے زبان ہی بند ہو گئی ہو۔ اس لڑکی کا دماغی توازن ٹھیک معلوم نہیں ہوتا تھا۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ فجر کی اذان ہو رہی تھی تو عابدہ میرے سامنے بیٹھی رو رہی تھی۔ اُس کے آنسو رُکتے ہی نہیں تھے۔ میں اُسے دیکھتا رہا۔

"آپ میرے خاوند کو تو گرفتار نہیں کریں گے؟" — اُس نے پوچھا۔

"نہیں" — میں نے جواب دیا۔

"اور مجھے؟"

"تمہیں بھی نہیں" — میں نے کہا — "شرط یہ ہے کہ پوری بات سُناؤ۔ اب جھوٹ نہ بولنا۔ میں تمہیں بچا لوں گا۔"

اُس نے کسی اور ترتیب سے بیان دیا تھا۔ میں اُس سے سوال بھی پوچھتا جا رہا تھا۔ اس طرح یہ بیان لمبا ہو گیا تھا۔ میں آپ کو سیدھے طریقے سے یہ عجیب کہانی سُنا دیتا ہوں۔

سوتیلی ماں اور اُس کی ماں

عابدہ بارہ تیرہ سال کی تھی جب اُس کی ماں مر گئی۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ پیار کرنے والی ماں کی موت نے عابدہ کا کیا حال کر دیا ہو گا۔ دو سال بعد اُس کے بڑے بھائی کی شادی ہو گئی۔ اُس کی بھابھی اچھی تھی۔ عابدہ سے وہ بڑی اچھی طرح پیش آتی تھی لیکن وہ اُس کی ماں نہیں بن سکتی تھی۔

ماں کی جگہ ماں ہی پوری کر سکتی ہے۔ شاداں عابدہ سے چار پانچ سال بڑی تھی۔ اُسے شروع سے ہی عابدہ کے ساتھ پیار تھا۔ شاداں جوانی کی عمر میں داخل ہوتی تو بھی ان کا پیار چلتا رہا بلکہ بڑھتا رہا۔ پھر عابدہ بھی جوانی میں داخل ہو

گئی۔ شاداں نے اس کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں شروع کر دیں۔

عابدہ جوان ہو گئی تھی اور اب وہ ہانڈی روٹی کر سکتی تھی۔ نہ کر سکتی تو گھر میں نوکرانی تھی۔ عابدہ کا بھائی باپ سے الگ ہو گیا اور دوسرے مکان میں رہنے لگا۔ یہ علیحدگی کسی جھگڑے کی وجہ سے نہیں ہوتی تھی۔ شاداں عابدہ کے گھر آتی ہی رہتی تھی۔ عابدہ کا بھائی اپنی بیوی کو لے کر دوسرے مکان میں چلا گیا تو شاداں عابدہ کے پاس زیادہ آنے لگی۔

عابدہ نے مجھے بتایا کہ ماں کے مرنے کے بعد اُس کے باپ کا رویہ بدل گیا تھا۔ اُس نے دو عورتوں کے ساتھ درپردہ دوستی لگا لی تھی۔ عابدہ کو یہ شک بھی تھا کہ اُس کے باپ نے نوکرانی کے ساتھ بھی ایسا ہی تعلق پیدا کر لیا تھا۔ نوکرانی صاف سُتھرے کپڑے پہن کر بنی ٹھنی رہنے لگی تھی۔

شاداں کی عمر اکیس بائیس سال ہو چکی تھی۔ وہ بڑی شوخ لڑکی تھی۔ وہ عابدہ کو نذیر کی محبت کی کہانیاں سناتی رہتی تھی۔ اِدھر عابدہ کے باپ مرادخاں نے شاداں کے ساتھ بے تکلف ہونا شروع کر دیا۔ ایک عید پر اُس نے شاداں کو شہر سے ریشمی کپڑے لا کر دیئے اور پیسے بھی دیئے۔ شاداں اُسے اپنی سہیلی کا باپ لہٰذا اپنا بھی باپ سمجھتی رہی لیکن باپ کی نیت خراب ہو چکی تھی۔

شاداں کی ماں نے بھی مرادخاں کے گھر آنا شروع کر دیا۔ وہ اتنی عمر میں بھی خوبصورت لگتی تھی۔ وہ مرادخاں کے ساتھ بے تکلف ہو گئی۔ یہاں تک کہ عابدہ نے دیکھا کہ شاداں کی ماں آتی اور مرادخاں اُسے اُوپر والے کمرے میں لے گیا۔ عابدہ نے ایسے کئی موقعے سنائے جب اُس نے شاداں کی ماں اور اپنے باپ کو اکٹھے دیکھا۔ وہی باپ جس نے عابدہ کو اُس کی ماں کی زندگی میں کبھی اونچا لفظ نہیں کہا تھا، اب اُسے ذرا ذرا سی بات پر ڈانٹ دیتا تھا۔ اُس کے دل میں عابدہ کا پیار رہا ہی نہیں تھا۔ اس شخص کا پیار تقسیم ہو چکا تھا۔

پھر وہ دن آیا کہ شاداں عابدہ کی سوتیلی ماں بن کر ہمیشہ کے لئے اُس کے گھر میں آ گئی اور اس کے آنے سے شاداں اور عابدہ میں جو اتنی پرانی محبت تھی

وہ اس گھر سے نکل گئی۔ شاداں کی شوخیاں جو عابدہ کو اچھی لگا کرتی تھیں وہ چالاکیاں بلکہ فریب کاریاں بن گئیں۔ شاداں پہلے ایک دو دن روتی رہی پھر وہ خوش رہنے لگی۔ اس کی ماں آجاتی تھی اور ماں بیٹی الگ کمرے میں بیٹھی کھسر پھسر کرتی رہتی تھیں۔

عابدہ کے لئے ماں کا پیار تو پہلے ہی مر چکا تھا۔ باپ کے پیار اور شفقت سے بھی وہ محروم ہو گئی۔ ایک یہ سہیلی رہ گئی تھی جس کے ساتھ وہ دُکھ سُکھ کی اور دل کی باتیں کر لیا کرتی تھی مگر وہ سہیلی اپنے آپ کو ملکہ اور عابدہ کو نوکرانی سمجھنے لگی۔ عابدہ اب تنہائی میں بیٹھی روتی اور آہیں بھرتی تھی۔ اُس کے دُکھوں میں اضافہ یہ دیکھ کر ہوا کہ شاداں اُس کی ماں کا زیور پہنتی تھی، اور یہ دُکھ بھی کہ اس کا باپ شاداں کے آگے پیچھے غلاموں کی طرح پھرتا رہتا تھا۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ شاداں کی ماں بھی عابدہ پر حکم چلانے لگی۔

"تم نے اپنے بھائی اور بھابھی کو نہیں بتایا؟" —— میں نے اُس سے پوچھا۔

"بتایا تھا" —— عابدہ نے جواب دیا —— "بھائی نے کہا کہ وہ دخل نہیں دینا چاہتا۔ اس سے باپ ناراض ہو گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری آپس میں تُو تُو میں میں ہو جاتے اور لوگ تماشہ دیکھیں۔ میری بھابھی نے بھی مجھ سے آنکھیں پھیر لی تھیں۔"

"کیا تمہیں معلوم تھا کہ شاداں نذیر سے ملتی ہے؟"

"معلوم تھا" —— عابدہ نے جواب دیا —— "مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ شاداں اور اس کی ماں میرا گھر خالی کر رہی ہیں۔ شاداں میرے باپ کے ساتھ اس طرح خوش رہتی ہے جیسے اس سے ہر طرح مطمئن ہے اور میرا باپ اس کا ہم عمر ہے، لیکن وہ اصل اطمینان نذیر سے حاصل کر رہی ہے۔ میں نے ایک روز ہمت کر کے اپنے باپ کو بتا دیا۔ باپ نے میرے مُنہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ آج بھی یاد آتا ہے تو میرا منہ درد کرنے لگتا ہے۔"

شاداں نے جب عابدہ کو نوکرانی سمجھ کر اسے ڈانٹنا شروع کر دیا تو عابدہ نے اسے کھری کھری سنانی شروع کر دیں۔ اس سے آئے دن دونوں

میں لڑائی جھگڑا ہوتا اور باپ کی طرف سے پھٹکار عابدہ پر ہی پڑتی۔

عابدہ کی شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ یہ میں آپ کو سُنا چکا ہوں کہ شاداں کی ماں نے کس طرح عابدہ کا رشتہ دوسرے گاؤں میں دشمنوں کے گھر کرا دیا۔ عابدہ بہت پریشان ہوئی۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کے سُسرال انتقاماً اُسے تنگ کریں گے۔ عداوت کے باوجود ان لوگوں کے رشتے ایک دوسرے سے ہوتے تھے اور لڑکیوں کے ساتھ زیادتی ہوتی تھی۔ انتقام کا نشانہ انہی کو بنایا جاتا تھا۔

عابدہ کی کسی نے نہ سنی۔ اُس کے باپ نے اُسے بیاہ دیا۔ شاداں اور اس کی ماں یہی چاہتی تھیں کہ عابدہ بھی اس گھر سے غائب ہو جاتے۔ یہاں سے عابدہ کی زندگی کا ایک اور تلخ دور شروع ہو گیا۔

زہر خود کھا لیتی

"اگر مجھے یہ خاوند نہ ملتا جس کا نام عزیز ہے تو میں نے جو زہر بیلیوں کو کھلایا ہے وہ میں خود کھا لیتی" —— عابدہ نے کہا —— "اُس کے پیار میں مجھے ماں کا، باپ کا، سہیلی کا، دل کے یار کا، روح اور جسم کا پیار مل گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ دوسرے آدمیوں کی طرح مجھے پاؤں کی جُوتی سمجھے گا لیکن اُس نے مجھے اس طرح سینے سے لگا لیا جیسے مجھے سیلاب سے نکال کر ڈوبنے سے بچا لیا ہو۔ میں اُس کے آگے بہت روئی اور اُسے کہا کہ مجھے دھوکہ نہ دینا۔ مجھ سے پیار چھیننے سے پہلے میرا گلا دبا کر مجھے مار دینا۔ اُس نے مجھے بازوؤں میں لے کر ایسا گلے لگایا کہ صبح ہو گئی۔"

خدا نے عابدہ کی دعائیں اور فریادیں سن لی تھیں اور اُسے محبت کرنے والا خاوند دے دیا تھا لیکن اُسے ساس ایسی دی جو چڑیل تھی۔ پہلے روز ہی ساس نے اُس پر اپنی فطرت ظاہر کر دی تھی۔

"میری بات کان کھول کر سن لے لڑکی!" —— ساس نے اُسے کہا —— "تُو چور دل اور بزدلوں کی بیٹی ہے۔ اُن ہیجڑوں میں میدان میں ہمارے

مردوں کے آمنے سامنے آنے کی جرأت نہ ہوتی تو ہمارے ایک بیل اور دُودھ دینے والی بھینس کو زہر دلوا دیا۔ میں نے قسم کھائی ہوتی ہے کہ بدلہ لے کر مروں گی۔ میں تجھے بتا دیتی ہوں کہ میرے گھر میں شہزادی بننے کی کوشش نہ کرنا۔ نوکروں کی طرح پڑی رہ یہاں۔ اونچی بات نہ کرنا"

"خالہ جان!" ـــــ عابدہ نے کہا ـــــ "اگر آپ نے مجھ سے انتقام لینا ہے تو مجھے زہر دے دیں۔ خوشی سے پی لوں گی"۔

"زبان نہ چلا میرے آگے!" ـــــ ساس نے اُسے ڈانٹ کر چُپ کرا دیا۔

عابدہ نے مجھے اُس ظلم و تشدد اور طعنوں کی بہت سی باتیں اور مثالیں سنائیں جس کا ساس اُسے ہر وقت نشانہ بناتے رکھتی تھی۔ اس کا سینہ چھلنی ہو جاتا تھا، دل زخمی ہو جاتا تھا لیکن رات کو خاوند اُس کے زخموں پر پیار اور محبت کی مرہم رکھ دیتا تھا۔ وہ عابدہ سے کہتا تھا کہ ماں کی لعن طعن سن لیا کرو اور اسے دل پر نہ بٹھایا کرو۔

ساس کی زبان پر یہ الفاظ چڑھے ہوتے تھے ـــــ "جب تک تیرے باپ کے ڈنگر مار نہ لوں مجھے چین نہیں آتے گا" ـــــ انہی دنوں مویشیوں اور گھوڑوں کا سرکاری میلہ لگا جس میں عابدہ کے باپ کے بیل کو انعام ملا۔ عابدہ کی ساس نے اب یہ کہنا شروع کر دیا ـــــ "میں اس بیل کو مروا کر بدلہ لوں گی"۔

عزیز نے اپنی ماں کو ایک بار سمجھانے کی کوشش کی کہ راجہ مراد خان نے ہمیں اپنی بیٹی دے دی ہے، اور ہمیں کیا چاہیئے۔ ماں نے آگے نہ سُنی۔ اُس کے مُنہ میں جو آیا اُس نے بک ڈالا۔ اس نے دل میں بٹھا لی کہ اُس کا بیٹا عابدہ کا مرید ہو گیا ہے۔ اُس نے عابدہ کو اور زیادہ پریشان کرنا شروع کر دیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ عابدہ بدکار ہے اور اسے طلاق دلانی ہے۔

آپ اس عورت کو پاگل نہ سمجھیں۔ ہماری گھریلو دنیا میں جسے آپ چار دیواری کی دنیا کہا کرتے ہیں ایسی بہت ساسیں پائی جاتی ہیں جو بہو کو نقصان پہنچانے کے لئے اپنے بیٹے کی زندگی جہنم بنا دیا کرتی ہیں۔ ایسی ساسیں دیہات میں ہی

نہیں شہروں میں بھی ہوتی ہیں۔ اَن پڑھ اور جاہل گھرانوں میں بھی اور تعلیم یافتہ گھرانوں میں بھی ہوتی ہیں۔ امیر گھرانوں میں اور غریب گھرانوں میں بھی۔ یہ ساس بھی اسی نسل کی تھی اور اُس کا بیٹا اس سے بالکل اُلٹ تھا۔ وہ عابدہ کے لئے سراپا پیار اور خلوص تھا۔

چھ مہینوں میں ساس نے عابدہ کا حال ٹی بی کے مریضوں جیسا کر دیا۔ عابدہ کے لئے سوائے خاوند کے کوئی پناہ نہیں تھی۔ باپ اور سوتیلی ماں نے تو اُسے گھر سے نکالا تھا۔ انہوں نے اُس سے کبھی پوچھا تک نہ تھا کہ زندہ ہو یا مر گئی ہو۔ عزیز کو اُس سے اتنا پیار تھا کہ اُس نے عابدہ کو یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ماں نے یہ سلسلہ جاری رکھا تو وہ عابدہ کو ساتھ لے کر گھر سے بھاگ جائے گا اور شہر میں کہیں محنت مزدوری کرتا رہے گا۔ عابدہ نے اُسے اس ارادے سے روکا تھا۔

ایک روز ماں بیٹے کی ان باتوں پر لڑائی ہو گئی۔ عابدہ کے لئے اگر ذرا سا سکون رہ گیا تھا تو وہ بھی ختم ہو گیا۔ اُس کی ساس نے اپنے خاوند اور بیٹے کو اور جو گالی گلوچ کرنی تھی وہ تو کی لیکن بار بار یہ الفاظ کہے ـــــ "تم دونوں اصل مرد ہوتے تو اپنے بیل اور بھینس کا بدلہ لیتے۔ میں اس بہو کو دیکھتی ہوں تو مجھے دونوں مویشی یاد آجاتے ہیں۔ بدلہ لو یا اس لڑکی کو یہاں سے نکالو"

عابدہ نے مجھے جو بیان دیا اس سے پتہ چلتا تھا جیسے اُس کی ساس بیل اور بھینس کے انتقام میں پاگل ہو گئی تھی۔

"اُس رات جب میں اور عزیز سونے کے لئے الگ چلے گئے تو عزیز کے آنسو نکل آئے" ـــــ عابدہ نے مجھے بیان دیتے ہوئے کہا ـــــ "اُس کے آنسو دیکھ کر میرے دماغ کو کچھ ہو گیا۔ جب عزیز نے میری آنکھوں میں آنسو دیکھے تو اُس نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا اور کہنے لگا کہ میں تمہیں نہیں رونے دوں گا۔ ماں، تو ماں، مجھے ساری دنیا کہے کہ عابدہ کو طلاق دے دو تو ساری دنیا کو اپنا دشمن بنا لوں گا، تمہیں نہیں چھوڑوں گا....

"کچھ دیر بعد عزیز سو گیا لیکن میں نہ سو سکی۔ وہ مجھے روتا نہیں دیکھ سکتا تھا اور میں اُسے روتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جوں جوں رات گزرتی جا رہی تھی

میرے دماغ کو کچھ ہونا جا رہا تھا، پھر دماغ اپنے مویشیوں پر اٹک گیا۔ ساس اگر یہ چاہتی تھی کہ اُس کے بیل اور بھینس کے بدلے ہمارے مویشی مارے جائیں تو یہ کام میں کر دوں گی اور اسے کہوں گی کہ اب مجھے عزیز کے ساتھ آرام اور سکون سے جینے دو....

"اپنے باپ کا اور شاداں کا خیال آیا کہ اُن کا نقصان ہو گا تو مجھے اُن کا سلوک بھی یاد آ گیا اور یہ بھی کہ اُنہوں نے مجھے گھر سے نکالا ہے اور یہ بھی کہ شاداں بدکار ہے۔ اور یہ بھی کہ اسی بات پر میرے باپ نے مجھے تھپّڑ مارا تھا.... میں نے ارادہ پکا کر لیا کہ ساس کا سینہ ٹھنڈا کر دوں گی۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ پکڑی جاؤں گی....

میں نے عزیز سے کہا کہ اپنے گاؤں جانے کو جی چاہتا ہے۔ تین چار دن رہ کر آجاؤں گی۔ عزیز نے کہا کہ وہ تھوڑی سی دیر کے لئے بھی میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے اُسے منوا لیا، پھر میں نے ساس کو الگ کر کے کہا ـــ خالہ! میں تمہارے بیل اور بھینس کا بدلہ لے کر آؤں گی۔ اگر اس کے بعد بھی تم نے مجھے اسی طرح تنگ کئے رکھا تو گاؤں میں پیپل کا جو درخت ہے، رات کو اس کے ساتھ رسّہ گلے میں ڈال کر لٹک جاؤں گی'....

"مجھے امید تھی کہ ساس کچھ کہے گی اور کچھ نہ کہا تو کوئی نہ کوئی بکواس ضرور کرے گی، لیکن اُس نے کچھ بھی نہ کہا۔ اُس کا مُنہ تھوڑا سا کھل گیا اور آنکھیں اتنی زیادہ کھل گئیں جیسے کھوپڑی سے باہر آ پڑیں گی۔ میں اُسے اسی حالت میں چھوڑ کر اُٹھ آئی اور اپنے گاؤں کی تیاری کرنے لگی....

"میں گھوڑی پر اپنے گاؤں آئی۔ ساتھ ایک نوکر آیا تھا۔ وہ گھوڑی لے کر چلا گیا۔ شاداں مجھے دیکھ کر خوش ہوئی۔ اُسے معلوم تھا کہ دو تین دن رہ کر چلی جاؤں گی۔ باپ نے ویسے ہی میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ مجھے دیکھ کر اُسے ذرا سی بھی خوشی نہیں ہوئی۔ اگر وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوتا اور میرے ساتھ پیار کرتا تو میں جس ارادے سے گئی تھی وہ بدل جاتا"۔

عابدہ کے بیان کا یہ تھوڑا سا حصہ سنایا ہے تاکہ آپ کو اُس کے جذبات کا اندازہ ہو جائے۔ وہ اوپر والے کمرے میں چلی گئی اور اُس نے جتنے دن

رہنا تھا اُسی کمرے میں رہنا تھا۔ اُس نے رات گزاری اور دوسرے دن کھیتوں میں گھومنے پھرنے نکل گئی۔ وہاں اُسے گاؤں کے کئی لوگ ملے۔ وہ ہر ایک سے اچھی طرح ملی اور اُس طرف نکل گئی جدھر سنیاسی کا ڈیرہ تھا۔ وہ سنیاسی کے پاس گئی اور کہا کہ دو کُتّوں کو مارنے کے لئے زہر چاہیئے۔ سنیاسی نے کہا کہ اُس کے پاس کوئی زہر نہیں۔

سنیاسی دراصل پیسے زیادہ لینا چاہتا تھا۔ اُس نے انکار ایسے طریقے سے کیا جس سے عابدہ سمجھ گئی کہ اس کے پاس زہر ہے۔ عابدہ نے آخر پندرہ روپے پیش کئے۔ سنیاسی شاید یہی چاہتا تھا۔ پندرہ روپے خاصی زیادہ رقم تھی۔ عابدہ نے یہ بھی کہا کہ زہر تیز چاہیئے اور ذرا زیادہ ہو۔ سنیاسی نے زہر دے دیا اور عابدہ سے اُس کا نام اور اُس کے باپ کا نام پوچھ لیا۔

اُسی روز عزیز آ گیا۔ وہ واقعی عابدہ کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اُس نے ایک رات وہاں گزاری۔ اگلے دن اُس نے عابدہ کو بتایا کہ وہ ایک سنیاسی سے دوائی لینے جا رہا ہے۔ وہ چلا گیا اور دوائی لے آیا اور پچھلے پہر عابدہ سے یہ وعدہ لے کر چلا گیا کہ وہ کل آ جائے گی۔ عابدہ نے اُسے کہا کہ وہ پرسوں اُسے لینے کے لئے آ جائے۔

عابدہ نے سرسوں کے پتے اپنے کمرے میں رکھ لئے تھے۔ رات کو جب سب سو گئے تو وہ دبے پاؤں نیچے آئی۔ اُس کے ہاتھ میں زہر اور پتے تھے۔ مویشیوں والے حصے میں گئی۔ نوکر سویا ہوا تھا۔ بیل بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس نے کھُرلی کے قریب کھڑے ہو کر پتوں پر زہر بکھیرا اور پتے کھُرلی میں رکھ دیئے۔ بیل نہ اُٹھے۔ عابدہ نے ایک پتا ایک بیل کے آگے کر کے پیچھے کر لیا۔ وہ بیل اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُسے دیکھ کر دوسرے دونوں بیل اُٹھے۔ ہرے پتوں کی مُشک نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ پتے کھانے لگے۔

اُس وقت نوکر کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے صحن میں آ کر دیکھا۔ عابدہ نے اُسے شاباش دی کہ وہ بڑا چوکس ہو کر سوتا ہے۔ اُسے یہ بھی کہا کہ دشمنوں کا کوئی بھروسہ نہیں، وہ ہوشیار رہا کرے۔ اُس وقت بیل زہر آلود پتے کھا رہے تھے۔

"میں اوپر چلی گئی"— عابدہ نے کہا —"اور باقی رات روتے گزار دی۔ میں اپنے دل کو تسلی دیتی تھی کہ میں نے اچھا کیا ہے لیکن یہ افسوس بھی ہوتا تھا کہ میں نے بہت بُرا کیا ہے۔ یہ اطمینان تو ضرور تھا کہ اب میری ساس خوش ہو جائے گی اور مجھے اور میرے خاوند کو محبت کی زندگی بسر کرنے دے گی۔ میں نے اب اپنے سسرال جا کر ساس کو بتانا تھا کہ اُس نے انتقام لینے کی جو قسم کھائی تھی وہ میں پوری کر آئی ہوں لیکن عزیز نے اگلے روز آنا تھا، پھر آپ آ گئے۔"

میں نے عابدہ سے زیادہ عجیب کردار دیکھے ہیں اور اس واردات سے زیادہ حیران کن وارداتیں دیکھیں اور ان کی تفتیش کی ہے لیکن عابدہ نے مجھ پر ایسا تاثر پیدا کیا کہ میں نے اس کیس کو یہیں ختم کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ میرا ارادہ تو یہ تھا کہ مجرموں کو سزا دلاؤں گا لیکن مجرم وہ سامنے آیا جس نے میرے ارادے توڑ دیئے۔ میں نے آپ کو اُس کا بیان بہت مختصر سنایا ہے۔ یہ بیان پڑھنے سے نہیں سننے سے تعلق رکھتا تھا۔ عابدہ نے آنسو بہاتے ہوئے اپنی مظلومیت کی داستان جس طرح سنائی تھی، اگر آپ سُنتے تو ہی آپ محسوس کر سکتے تھے کہ میں نے اس کیس کو ختم کرنے کا فیصلہ کیوں کر لیا تھا۔

میں نے اپنے لئے یہ مشکل پیدا کر لی تھی کہ بیلوں کا پوسٹمارٹم کرا لیا تھا اور چارہ اور بیلوں کے معدے وغیرہ کے اجزا معلوم کرنے کے لئے بھیج دیئے تھے۔ اس طرح انہیں ریکارڈ میں آ جانا تھا، پھر بھی میرے پاس گنجائش تھی کہ میں کیس کو فائل کر دیتا۔

میں نے دلاور خان کے بیل اور بھینس کی زہر خورانی کا کیس ختم کر دیا تھا۔ اس سے میں مراد خان کو قائل کر سکتا تھا کہ وہ اپنے بیلوں کو بھول جائے۔

میں نے دلاور اور اُس کے بیٹے عزیز کو بلایا۔ دلاور کی میں نے جو بے عزتی کی وہ میں لکھ نہیں سکتا۔ میں اُسے کہہ رہا تھا کہ اُس نے اپنی بیوی کو اتنی ڈھیل دے رکھی ہے کہ وہ فساد کراتی پھرتی ہے اور اُس نے اس لڑکی کو مجبور کر دیا تھا کہ یہ اپنے باپ کے بیلوں کو زہر دے دے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ خود

جائے اور اپنی بیوی کو ساتھ لے آئے۔ میں اُس کی نیک چلنی کی ضمانت لوں گا۔ وہ منت سماجت کرنے لگا۔ میں اُسے ڈرا رہا تھا۔ اُسے اُس کے گاؤں بھیج دیا۔ عزیز کو میں نے بہت شاباش دی۔

پھر میں نے مراد خان کو بلایا۔ اُسے پہلی بات یہ کہی کہ تم نے گھر میں طوائف رکھی ہوئی ہے اور اُس کے یار تمہارے گھر میں آتے ہیں۔ میں نے اُسے عابدہ کا بیان سنایا اور کہا کہ اپنی بیٹی سے یہ جرم تم نے کرایا ہے۔ اس شخص کی تو میں نے ایسی حالت کر دی کہ وہ زار و قطار رونے لگا۔ میں تو غصے سے بے قابو ہو گیا تھا۔ اُسے پوری طرح ننگا کیا اور کہا کہ اپنے بیلوں کو دل سے اُتار دے۔

عابدہ کی ساس کا مجھے انتظار کرنا پڑا۔ وہ آئی تو اُسے کہا کہ تمہاری بہو نے تمہارے بیل اور بھینس کا انتقام لے لیا ہے اور میں تمہیں گرفتار کر کے تھانے لے جا رہا ہوں۔ پانچ سال قید دلاؤں گا۔ اُس نے تو تڑپنا شروع کر دیا اور میری زبان مشین گن کی طرح چل پڑی۔ میں نے بڑی بے ہودہ بکواس کی اور ویسے ہی ایک کاغذ پر اُس کا انگوٹھا لگوا لیا۔ دیہاتی انگوٹھا لگوانے کو سمجھتے تھے جیسے اُن کا انگوٹھا کاٹ لیا گیا ہو۔ میں نے اُسے کہا کہ اب تُو ذرا سی بھی زبان درازی کرے گی تو سیدھا جیل خانے میں پہنچاؤں گا۔

پھر میں نے دونوں پارٹیوں کے آدمیوں کو سامنے بٹھا لیا۔ میرا غصہ ابھی عروج پر تھا۔ میں نے جو مُنہ میں آیا کہہ ڈالا اور انہیں ڈرا دھمکا کر رخصت کر دیا۔ سنیاسی کے خلاف میں کوئی کارروائی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ میں نے کیس گول کر دیا تھا۔